انتخابِ کلامِ چکبست

عبدالستار دلوی

بار اوّل

تعداد ایک ہزار

قیمت : دو روپے پچاس نئے پیسے

ناشر

عارف پبلشنگ ہاؤس ۔ کلاں محل ۔ دہلی ۔

مطبوعہ ۔ اعلیٰ پریس ۔ دہلی

ترتیب

بیکار تعلّی سے ہے نفرت مجھ کو

یوں دادِ سخن نہیں یہ عادت مجھ کو

کس واسطے جستجو کروں شہرت کی

اک دن خود ڈھونڈھ لے گی شہرت مجھ کو

انیسویں صدی کا نصف آخر ہماری سیاسی، سماجی و معاشرتی تاریخ کا اہم ترین دور ہے۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں ہندوستانیوں کی ناکامی کے پس منظر میں بدیسی حکومت کی جڑیں زیادہ مضبوط ہوتی گئیں اور انھیں سیاسی حالات کی روشنی میں آزادی کی منظم کوششوں کے سلسلے میں ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد ڈالی گئی۔ ہندوستانیوں میں زندگی کی رمق کے آثار اسی زمانہ میں پیدا ہونے لگے۔ آزادی کی تحریک تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔ پرانے انداز و فکر و معاشرت اور سیاسی و سماجی نظریات میں تبدیلی پیدا ہوئی اور اس کی جگہ مغربی علوم و فنون لینے لگے اور نئے رہنماؤں کی سرکردگی میں جدید ہندوستان کی تعمیر کا کام شروع ہوا۔ ہندوستان کی تعمیر نو کے اسی زمانہ میں چکبست پیدا ہوئے۔

بیسویں صدی کا ربع اول جس میں چکبست کی شاعری پروان چڑھی ہندوستان کی تاریخ کا نشاۃ الثانیہ تھا جبکہ ہندوستان کو غیر ملکی شکنجوں سے نکالنے کی کوششوں

اور تحریکوں میں مزید تیزی پیدا ہوئی۔ حقیقی معنوں میں آزادی کی تحریک ۱۹۰۸ء کے بعد شروع ہوئی اور ہمارے سیاسی رہنماؤں نے ایک پلیٹ فارم پر آکر اس سعی کو مشکور کرنے کی کوشش کی۔ ترک موالات، ہندو مسلم اتحاد، تعلیم نسواں اور ایسے ہی کئی موضوعات و واقعات ہماری تاریخ کے اہم عنوانات ہیں یہی وہ زمانہ تھا جبکہ روس کے انقلاب کے اثر سے قومیت کا احساس اور سرمایہ و جاگیردارانہ نظام سے حقارت اور نفرت کے جذبات تیز سے تیز تر ہوتے جا رہے تھے۔ تاریخ کے ان واقعات و احساسات کی اس تبدیلی نے افراد کی ذہنیت کو بھی بدل کر رکھ دیا تھا۔

تاریخ کے انقلابات نے جہاں بساطِ سیاست پر اثر ڈالا ہے وہیں ان انقلابات کے اثرات ہمارے ادبیات پر بھی گہرے پڑے، آزاد، حالی اور کرنل ہالرائیڈ نے اردو ادب میں ایک انقلابی تحریک کا آغاز کیا اور اسی تحریک کے تحت ایک نئی نسل نے بھی کام کیا۔ شبلی، ظفر علی خاں، سرور، کیفی، جوش وغیرہ اسی جدید نسل کے نمائندے ہیں۔ ان لوگوں نے پرانی روایتی شاعری سے ہٹ کر نئے وسعتیں عطا کیں اور نئے پیرایہ بیان سے روشناس کرایا۔ انہوں نے اپنے حالات اور ماحول سے مضامین اخذ کئے۔ اگر ان کی شاعری کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ عصری ماحول اور سیاست و اخلاق ان کی شاعری کا موضوع رہے ہیں۔ چکبست بھی چونکہ اپنے ماحول کی پیداوار تھے ان عصری سیاسی و سماجی اثرات سے بچ نہ سکے اور یہی وجہ ہے ان کی شاعری، جنگِ آزادی، قومی تصورات، حبُ الوطنی، تعلیمِ نسواں اور ریفارم سے عبارت ہے۔

چکبست اگرچہ تخلص کے گنہگار نہیں تاہم ان کا نام بزمِ شعراء میں بڑی اہمیت رکھتا

ہے۔ قدرت نے انہیں ابتداہی سے مذاق شعری سے نوازا تھا جو بعد میں برگ وبار کی صورت میں ہمارے سامنے نمودار ہوا۔ اور ہمارے سماج و معاشرے نے اس سے استفادہ کیا۔

چکبست لکھنؤ اسکول سے تعلق رکھتے تھے، جو اپنے مخصوص انداز، لب و لہجہ، تکلف اور خارجیت کے لئے مشہور رہے۔ لکھنوی شعراء نے خارجیت پر زیادہ زور دیا۔ انہوں نے شعر کے ظاہری پیکر پر توجہ کی روح پر نہیں۔ ان کے ہاں ہر جگہ جمال زیادہ ہے جمالیاتی نظریہ اور حقیقت گری ہے۔ لیکن جلال کا پرتو تک نہیں۔ اور یہی چیز ہے جو بیک وقت کمال اور زوال دونوں کو ظاہر کرتی ہے۔ ان شعراء نے زبان کی تراش وخراش میں حصہ لیا، اسے ڈھالنے سنوارنے میں مدد کی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کوئی ادب محض ظاہری شان وشکوہ سے زندہ نہیں رہ سکتا۔ زندہ رہنے کے لئے توانائی کی پہلے ضرورت ہے۔ بعد میں حسن کی۔ زندگی کی بنیاد قوت اور توانائی ہے حسن نہیں۔ بنیاد پر عمارت قائم ہوتی ہے، خوبصورت شیشوں ایرانی قالینوں اور بجلی کے قمقموں پر نہیں۔ لکھنؤ اسکول میں بڑی حد تک آتش نے مرصع سازی اور معنویت پر بھی دھیان دیا لیکن چکبست لکھنؤ اسکول کے وہ نمائندہ شاعر ہیں جنہوں نے مرصع سازی اور معنویت کو ساتھ ساتھ آگے بڑھایا۔ اردو شاعری کو صنعت گری کے علاوہ موضوع وخیال کی نئی نئی جنتوں سے بھی آشنا کرایا۔ انھوں نے محسوس کرایا کہ زندگی صرف چوٹی اور انگیا۔ دہن وکمر تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس میں آسمان کی سی وسعتیں ہیں۔ حسن سے ہنوز ہم نا آشنا ہیں۔ لکھنؤ کی خارجیت سے ہٹ کر چکبست نے لکھنؤ میں داخلیت کو رواج دیا۔ اور شاعری میں چونچلوں اور معاملہ بندیوں

کو کم کر کے حیات و کائنات کے مسائل کو اپنے ملک اور سماج کی درد مندانہ کیفیت کو محسوس کر کے الم آگیں داستانیں سنائیں اور شاندار و پُر شکوہ ماضی کی روشنی میں امید افزا مستقبل کی طرف رہنمائی کی۔ ان کی شاعری میں جمال بھی ہے اور جلال بھی اور یہی وجہ ہے کہ ان کا شمار اردو کے بڑے شعراء میں ہوتا ہے ؎

نہ ہو جلال تو حسن و جمال بے تاثیر
نرا نفس ہے اگر نغمہ ہو نہ آتشناک

نغمہ کے لئے آتش ناکی ضروری ہے بغیر آتشناکی کے اس میں تاثیر نہیں پیدا ہو سکتی لکھنؤ اسکول سے تعلق ہونے کی وجہ سے چکبست نے آتش و انیس کے اثرات کو ابھار کر ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی چکبست حالی کے فلسفہ شعر اور اصول شاعری سے زیادہ متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ چکبست کا حالی سے متاثر ہونا صرف کتابی theoretical ہی نہیں بلکہ عملی بھی ہے۔

آزاد اور حالی سے پہلے اردو شاعری اپنی مخصوص روایتی ڈگر پر چلتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ہمارے ادب میں دور غزل کی آمریت کا دور تھا۔ جو یکسر گل و بلبل شمع و پروانہ زلف با خنجر تیغ ابرو اور جنازہ و کفن سے لیس دکھائی دیتی ہے۔ آزاد اور حالی پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس روایت پرستی اور لفظی صنعت گری کے خلاف آواز اٹھا کر اردو شاعری کو زمانہ کے بدلتے ہوئے رجحانات اور اس کے نئے دھاروں کی طرف پھیرنے کی کامیاب کوششیں کیں اور جدید نظم کو رواج دیا۔

آزاد اور حالی کے پیچھے ایک نئی پود نئے ماحول اور حالات میں پرورش پا رہی تھی۔ حالات کے تقاضے اور زمانہ کی نئی مانگ جس کی طرف یہ بزرگ اشارہ کر گئے

تھے۔ ان ہی کسی ہوئی کلیوں کی نشوونما کرنے میں کامیاب ہوئے جو آگے چل کر خوشنما پھولوں کی صورت میں باغِ اردو کو مہکانے والی تھیں، انھیں نئی کلیوں میں اقبال، چکبست، سرور جہاں آبادی، سلیم پانی پتی وغیرہ مشہور کلیاں ہیں جنہوں نے کھل کر ایک عرصہ تک ہندوستانی فضا کو معطر کیا اور آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے ذہنی اور اخلاقی تربیت گاہ کی شعر و ادب کے روپ میں تعمیر کی۔

چکبست کی شاعرانہ حیثیت نظم و غزل دونوں میں مسلم ہے۔ اردو شاعری کی روایت کے مطابق چکبست نے بھی غزل کے ذریعہ اپنی شعری صلاحیتوں کو ابھارنے کی کوشش کی اور پچاس کے قریب غزلوں سے گلشنِ اردو کو مزین کیا ہے۔ چکبست کی یہ غزلیں اپنی ظاہری اور معنوی خوبیوں کی وجہ سے اردو کی کامیاب غزلوں میں سے ہیں۔ چکبست کی ان غزلوں میں آتش، غالب اور حالی کے اثرات نمایاں طور پر موجود ہیں۔ چکبست نے آتش کی مرصع کاری کو مدنظر رکھتے ہوئے زبان کو حسن اور فنکارانہ خوبصورتی عطا کی اور اپنے جمالیاتی احساس کو ہمارے سامنے پیش کیا۔ انہوں نے اپنی غزلوں کو معاملہ بندی اور مخصوص لکھنوی خارجیت سے معرا کرتے ہوئے، ان میں بادہ و ساغر کا بھی ذکر کیا ہے۔ اور ساتھ ہی اِن غزلوں کو پیغامی بنا کر ان کے حسن کو دوبالا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ چکبست کی غزلوں پر غالب کا اثر بھی موجود ہے۔ جو ظاہری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے قابلِ تحسین ہے۔ غالب کے اس مخصوص رنگ کو ایک حد تک جس کامیابی کے ساتھ چکبست نے اپنایا ہے اس سے چکبست کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اگرچہ چکبست

کے ہاں غالب کی انفرادیت، انا، تیور اور تڑپ ہے اور نہ ہی میر کا سوز و گداز۔ تاہم چکبست نے اپنی فنکاری سے اس میں اثر انگیزی کی صلاحیتیں پیدا کر دی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کچھ ایسا پاسِ غیرت اُٹھ گیا اس عہدِ پُر فن میں
کہ زیور ہو گیا طوقِ غلامی اپنی گردن میں
شجر سکتے میں ہیں خاموش ہیں بلبل نشیمن میں
سدھارا قافلہ پھولوں کا سنّاٹا ہے گلشن میں
ہوائے تازہ دل کو خود بخود بے چین کرتی ہے
قفس میں کہہ گیا کوئی بہار آئی ہے گلشن میں

ذیل کی غزل بھی غالب ہی کے رنگ کی ایک عمدہ مثال ہے۔ جس میں وہی رنگ و آہنگ اور خیال میں تنوع و نفاست ہے جو غالب کے کلام کی خصوصیت ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس میں غالب ہی کی لے اور انداز موجود ہونے کی وجہ سے اس پہ غالب کی غزل ہونے کا دھوکہ ہوتا ہے۔

دردِ دل، پاسِ وفا جذبۂ ایماں ہونا
آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا
زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے انہی اجزا کا پریشاں ہونا
ہم کو منظور ہے اے دیدۂ وحدت آگیں
ایک غنچہ میں تماشائے گلستاں ہونا

دختر حسن پہ مُہر ید قدرت سمجھو
پھول کا خاک کے تودے سے نمایاں ہونا
گل کو پامال نہ کر لعل و گہر کے مالک
ہے اسے طرۂ دستارِ گریباں ہونا

چکبست کی غزلوں میں حسن و عشق کے روایتی مضمون ہی نہیں بلکہ موجودہ دور کی روح بھی جھلکتی ہے وہ کائنات کے گیسوؤں کو سنوارتے ہیں۔ سماج، سیاست معاشی اور اقتصادی زبوں حالی اور نفاق، گبر و مسلماں، چکبست کی غزلوں کے محبوب مضامین ہیں۔ اور اس طرح وہ غزل کو قوم کی تعمیر کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ غزل کے موضوع میں تبدیلی اور تنوع کی دلکشی حالی کے زمانے ہی سے شروع ہو چکی تھی۔ اقبال اور چکبست کے یہاں اسے معراج نصیب ہوئی۔

غزل کی آرائش و تزئین کے بعد جب ہم شاعر کی نظموں پر نظر ڈالتے ہیں تو ان میں بھی ہمیں مقصدیت بلند اور اہم مطمع نظر، عصری سیاسی اور سماجی حالات و واقعات اور سب سے زیادہ حبِّ وطن کا جذبہ دکھائی دیتا ہے۔

چکبست کا نمایاں کارنامہ ان کی نظم گوئی ہے۔ ان کے مجموعۂ کلام "صبحِ وطن" کی ابتدا انھیں نظموں سے ہوتی ہے۔ جو متعدد حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصہ کی نظمیں حبُّ الوطنی کے جذبہ سے سرشار ہو کر لکھی گئی ہیں۔ اقبال کے بعد چکبست ہی وہ تنہا شاعر ہیں جن کے کلام میں حبُّ الوطنی کے عناصر سب سے زیادہ رچے ہوئے ہیں۔ انہوں نے وطن کی محبت کا جو راگ گایا ہے اس کی دھیمی لے اور نغمگی چکبست کا اپنا کارنامہ ہے یہ نظمیں پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے گویا حبُّ الوطنی کے جذبات سے ایک سیلاب ہے جو لہراتا آتا ہے۔ ان نظموں میں جذبہ اور عقل کا جو امتزاج ہے

وہ اقبال کے کلام کی نمایاں خصوصیت ہے۔ جسے چکبست نے بڑی حد تک اپنا لیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری جوش کی شاعری کی طرح ایجیٹیشنل شاعری نہیں بننے پائی۔ یہ جذبات اور تاثرات جو چکبست کی شاعری سے پیدا ہوتے ہیں۔ ہمارے دل و دماغ پر نقش کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ زبان کی سادگی و صفائی کی وجہ سے ان نظموں کے تاثر میں بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ چنانچہ "ہمارا وطن دل سے پیارا وطن" اور "وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک" کے دلنشین نغمے چکبست ہی نے الاپے ہیں۔ ان نظموں کو جن کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے۔ چکبست نے خصوصیت کے ساتھ بچوں کے لئے لکھا تھا۔ جس کی وجہ سے ان نظموں کا بچوں کی عمر اور نفسیات کے لحاظ سے آسان اور سہل ہونا ضروری تھا۔ لیکن جب ہم دوسری نظموں پر غور کرتے ہیں تو ان میں بھی چکبست کی سادگی و پُرکاری کے اثرات واضح طریقے سے پائے جاتے ہیں۔ "مادرِ ہند کی عظمت" اس کی جبیں پر نورِ حسنِ ازل کی تابندگی، ہر صبح خورشید پُر ضیا کا ہمالیہ کی چوٹی گوندھنا، اس کا علم و فن، اس کے رشی و منی، سوربیر و شہنشاہوں اور راجاؤں کا ذکر جس محبت اور فنکارانہ چابکدستی سے کیا ہے وہ اردو نظم کے لئے مایۂ امتیاز ہے ؎

شیدائے بوستاں کو سرو سمن مبارک — رنگیں طبیعتوں کو رنگِ سخن مبارک
بلبل کو گل مبارک، گل کو چمن مبارک — ہم بیکسوں کو اپنا پیارا وطن مبارک

غنچے ہمارے دل کے اس باغ میں کھلیں گے
اس خاک سے اٹھے ہیں اس خاک میں ملیں گے

ہے جوئے شیر ہم کو نورِ سحر وطن کا — آنکھوں کی روشنی ہے جلوہ اس انجمن کا

ہے رشکِ مہر ذرّہ اس منزلِ کہن کا   تلتا ہے برگِ گل سے کانٹا بھی اس چمن کا
گرد و غبار یاں کا خلعت ہے اپنے تن کا
مر کر بھی چاہتے ہیں خاکِ وطن کفن کو

اپنے ملک کی غلامی سے چکبست کو تکلیف پہنچتی ہے۔ لیکن سب سے زیادہ تکلیف دہ چیز ہندوستان کی سیاسی غلامی نہیں بلکہ ذہنیت کی غلامی اور تہذیب فرنگی کی کورانہ تقلید ہے، جہل اور نفاق ہے۔ ہندوستانی ذہنوں پر جمود کے جو اثرات ہیں اس کا مرثیہ چکبست ہی کی زبانی سنئے اور ان کی حب الوطنی کی شدت کا اندازہ لگائیے ؎

برسوں سے ہو رہا ہے برہم سماں ہمارا   دنیا سے مٹ رہا ہے نام و نشاں ہمارا
کچھ کم نہیں اجل سے خوابِ گراں ہمارا   اک لاش بے کفن ہے ہندوستاں ہمارا
علم و کمال و ایماں برباد ہو رہے ہیں
عیش و طرب کے بندے غفلت میں سو رہے ہیں

اس سوگواری اور الم انگیزی کا لازم   نتیجہ تھا کہ پکار اٹھے ؎
اے صورِ حبِ قومی اس خواب سے جگا دے   بھولا ہوا افسانہ کانوں کو پھر سنا دے
مردہ طبیعتوں کی افسردگی مٹا دے   اٹھتے ہوئے شرارے اس خاک سے دکھا دے
حبِ وطن سمائے آنکھوں میں نور ہو کر
سر میں خمار ہو کر دل میں سرور ہو کر

اس سلسلے میں مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری کا خاص موضوع اور پیغام وطن کی محبت ہے اور چاہتے ہیں کہ ہر فرد اس جذبہ سے سرشار اپنے ملک کی فکر

بیں ہمہ تن مصروف رہے، یہی نہیں کہ وہ صرف دوسروں کو اس کی تلقین کر رہے ہوں بلکہ وہ خود بھی اپنے سینہ پر مادرِ ہند کی تصویر لٹکائے، پیروں میں بیڑیاں اور گلے میں کفنی پہنے ہوئے ہیں اور اسی تصویر کو وہ عاشقِ آزادی کی تصویر سمجھتے ہوئے زنجیر کی جھنکار کو آزادی کے نغمہ میں ملا دیتے ہیں۔

اردو شاعری میں سیاسی رجحان کی ابتدا میر، حاتم اور سودا ہی کے زمانہ سے شروع ہو چکی تھی، دلی کی بربادی کی داستانیں بھی ہمارے شاعروں کے اسی رجحان کا پتہ دیتی ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد یہ رجحان اور تیز ہوا۔ سیاسی تحریکوں کے ساتھ اس میں اور توانائی آتی گئی یہانتک کہ پھر یہ اردو شاعری میں ایک مستقل موضوع کی صورت اختیار کرے گا۔ غزل اور نظم دونوں میں بلیغ سیاسی اشارے اور کنائے پائے جاتے ہیں۔ ۱۹۰۶ء میں سیلف گورنمنٹ کے مطالبہ کے ساتھ یہ رجحان تیز سے تیز تر ہونے لگا۔ ۱۹۱۶ء میں ہوم رول کی تحریک سے متاثر ہو کر ہمارے شاعروں نے بھی اس تحریک میں حصّہ لے کر اسے عوام تک پہنچانے کی سعی بلیغ کی، ہندوستان کی تاریخ میں یہ زمانہ بڑی خصوصیت کا حامل ہے۔ آزادی کا احساس عام ہو چکا تھا۔ ہوم رول کی تحریک میں مسز اینی بسنٹ کی شرکت نے اسے بڑی تقویت بخشی اور کانگریس اور مسلم لیگ دونوں متحد ہو کر آزادی کے لئے سرگرم عمل ہو گئیں اور ایک عام آدمی سے لیکر قومی لیڈروں تک سب کے دل جوشِ قومی سے لبریز ہو گئے۔ چکبست نے اپنے دردِ وطن اور حبِ قومی کے جذبہ سے سرشار ہو کر اس تحریک کی اشاعت میں اپنی شاعری کے ذریعہ عملی حصّہ لیا اور اپنے مطالبات کو واضح طریقے سے عوام میں عام کیا جو ان کے دین و ایمان کا

جز بن گئے تھے ۔

جو دل سے قوم کے نکلی ہے وہ دعا ہے یہی
تھا جس پہ ناز مسیحا کو وہ صدا ہے یہی

دلوں کو مست جو کرتی ہے وہ ہوا ہے یہی
غریب ہند کے آزار کی دوا ہے یہی

نہ چین آئے گا بے ہوم رول پائے ہوئے
فقیر قوم کے بیٹھے ہیں لو لگائے ہوئے

یہ جوشِ پاک زمانہ دبا نہیں سکتا
رگوں میں خوں کی حرارت مٹا نہیں سکتا

یہ آگ وہ ہے جو پانی بجھا نہیں سکتا
دلوں میں آ کے یہ ارماں جا نہیں سکتا

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

چکبست "صبح وطن" کے دوسرے حصہ میں سماجی مصلح کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ چکبست کا زمانہ ہمارے سماج کا مغربی تہذیب و تمدن سے متاثر ہونے کا زمانہ تھا۔ انگریزوں کے ساتھ ہندوستان پر صرف بدیسی حکومت ہی نہیں آئی بلکہ ان کی ذہنیت، طور و طریق، عادات و خصائل بھی آئے۔ چنانچہ انگریزی یا مغربی اثرات کے سلسلے میں ہمارے یہاں دو جماعتیں پیدا ہوئیں۔ پہلی جماعت جو مغرب زدگی میں انتہا پسند تھی، ان کا اٹھنا بیٹھنا، سوچنا، سمجھنا، یہانتک کہ کھانا اپینا بھی انگریزی میں ہوتا تھا۔ یہ ہر چیز کو انگریزی ہی کی روشنی میں دیکھنے اور سمجھنے کے قائل تھے۔ دوسرا گروہ اعتدال پسند تھا، وہ مغرب کی ہر چیز سے چونکتا نہیں تھا، اکبر کی طرح پائپ اور ٹیپ یہانتک کہ ہوائی جہاز سے بھی گھبراتا گیا یعنی وہ مغرب کی ہر چیز کو آسمانی چیز سمجھکر صلیب کی طرح گلے میں لٹکائے جانا پھرتے

تھے، وہ حدِ اعتدال کے قائل تھے، انھوں نے مغرب کی اچھی چیزوں کو اپنایا جس سے ہمارے ذہن روشن ہونے تھے اور ہمارے ملک کی ترقی و بہبود میں جن کا شمول جزو لاینفک تھا۔ چکبست اسی اعتدال پسند گروہ سے تعلق رکھتے تھے وہ اکبر کی طرح سائنس کے مخالف نہیں تھے بلکہ اس کی افادیت پر غور کرتے تھے اور ہر اس چیز کو نظر انداز کرتے گئے ہیں جس سے ہماری تہذیب کی قدروں، اصولوں، اور بلند اور عظیم روایتوں پر حرف آتا تھا، انھوں نے مغرب کی ہر اچھی چیز کو قبول کرنے کی ترغیب دلائی اور ایسی چیزوں سے جو ہماری تہذیب، تاریخ، روایات اور مزاجوں کے موافق نہ تھیں ان کی تکذیب کی، اس سلسلے میں وہ تعلیم، عورتوں کی آزادی اور تعلیم وغیرہ سے متعلق جن مصلحانہ خیالات کا اظہار کرتے ہیں اس سے ان کی اعتدال پسندی کا ثبوت ملتا ہے اپنی نظم "پھول مالا" میں وہ لڑکیوں سے مخاطب ہو کر انھیں آزادی کا معیار، ظاہرہ نمود و نمائش بچوں سے بیگانگی وغیرہ سے روشناس کراتے ہوئے مغرب کی کورانہ تقلید سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور "نوجوانوں سے خطاب" میں ان کو تشنۂ علم میں ہمیشہ غرقاب رہنے کا نیک مشورہ دیتے ہیں۔ لڑکیوں سے خطاب (پھول مالا) کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

روش عام پہ مردوں کی نہ جانا ہرگز
داغ تعلیم میں اپنی نہ لگانا ہرگز

رنگ ہے جن میں مگر بوئے وفا کچھ بھی نہیں
ایسے پھولوں سے نہ گھر اپنا سجانا ہرگز

رخ سے پردہ کو اٹھایا تو بہت خوب کیا
پردۂ شرم کو دل سے نہ اٹھانا ہرگز

نیک بچوں کی خبر قوم کے مردوں کو نہیں
یہ ہیں معصوم انھیں بھول نہ جانا ہرگز

ہم تمہیں بھول گئے اس کی سزا پاتے ہیں
تم ذرا اپنے تئیں بھول نہ جانا ہرگز

مذہب انسان کی اصلاح وترقی میں سب سے زیادہ ممد ومعاون ثابت ہوتا ہے۔ اس کی زبردست قوت انسان کے دل ودماغ میں خلوص ومحبت، سچائی اور وفاداری کے جذبات پیدا کرتی ہے، چنانچہ مذہب اور مذہب سے متعلقہ چیزوں کو بھی انھوں نے شاعرانہ پیرایۂ بیان میں پیش کیا ہے "گائے" کی عقیدت سے مملو چکبستؔ کی نظم ان کی مذہبیت اور اس غریب جانور کی محبت کا حسین اور پرکیف ثبوت ہی نہیں اس کی احسان مندی کا اعتراف بھی ہے ؎

صاحبِ دل تجھے تصویرِ وفا کہتے ہیں　　چشمۂ فیض خدا مردِ خدا کہتے ہیں
دردمندوں کی مسیحا شعرا کہتے ہیں　　ماں تجھے کہتے ہیں ہندو تو بجا کہتے ہیں

کون ہے جس نے تیرے دودھ سے منہ پھیرا ہے
آج اس قوم کی رگ رگ میں لہو تیرا ہے

"صبحِ وطن" کے اسی حصہ میں انھوں نے رامچندر جی کو بھی خراجِ عقیدت پیش کیا ہے تعجب ہے کہ اردو جیسی ہندوستان گیر زبان میں جو یہیں پھلی پھولی اور پروان چڑھی اس میں ابھی ہندوستان کی تاریخ کے عظیم اور تاریخی کارنامے نظم نہیں ہوئے، شاہ نامہ اسلام کی طرح رزم نامۂ مہابھارت اور رامائن کو بھی بہت پہلے نظم ہو جانا چاہیئے تھا، تاہم اس سلسلہ میں چکبست نے رامائن کے ایک سین کو نظم کیا ہے۔ چکبست نے اپنی تمام نظمیں مسدس کی شکل میں لکھی ہیں جن پر انیسؔ کی شاعری کے اثرات مرتسم ہیں۔ "رامائن کا ایک سین" بھی مسدس ہی کی شکل میں ہے جو اپنی ڈرامائیت، تاثیر، وقت اور موقع کے لحاظ سے الفاظ کے انتخاب (Diction) کی وجہ سے اردو کی بہترین نظموں کے انتخاب میں جگہ پانے کی

مستحق ہوتے ہوئے شاعر کی قادر الکلامی سے دلالت کرتی ہے۔ تمام خیالات اور جذبات جو اس نظم میں پیش کئے گئے ہیں۔ نہایت ہی فطری انداز میں ہمارے سامنے آتے ہیں اور اس سے کسی قسم کی بناوٹ تکلف اور مبالغہ کا احساس نہیں ہوتا، ہر بات دل سے نکلی ہوئی ہونے کی وجہ سے قدسی الاصل معلوم ہوتی ہے۔ ماں کی گفتگو میں وہی درد، کسک، پیار اور محبت کے ملے جلے جذبات ہیں اور رامچندر بھی اپنے گیان اور سمجھ بوجھ کے مطابق ماں کی ہمت افزائی اور ڈھارس بندھانے کی کوشش میں کوشاں نظر آتے ہیں۔ اس نظم کا ارتقا جس منظم اور فطری انداز میں ہوا ہے، اس سے چکبست کے مشاہدے اور عمق ذہن کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے۔ نظم کی ابتدا میں رامچندر جی باپ سے خدا کا نام لیکر رخصت ہونے کے بعد جو دفا کی دوسری منزل میں ماں سے اجازت طلب کرنے جاتے ہیں تو ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کی لڑی تھی اور اس خیال سے کہ ان آنسوؤں کو دیکھنے سے ماں کی حالت غیر ہو جائے گی دامن سے اشک پونچھ دیتے ہیں، اس کے بعد نظم جس انداز میں آگے بڑھتی ہے۔ اس سے چکبست کی محاکات میں دسترس کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔" دنیا کا ہو گیا ہے یہ کیسا لہو سپید" " تم میرے لال تھے مجھے کس سلطنت سے کم" " تم ہی نہیں تو آگ لگاؤں گی راج کو" " آسان مجھ غریب کی مشکل اجل کرے" وغیرہ کتنی ضرب الامثال ہیں جس کے استعمال سے شاعر نے نظم کی خوبصورتی اور حسن میں اضافہ کیا ہے، اسی طرح بچہ کی منہ سے ایسی ہی باتوں کا اظہار ہوا ہے جو اس کے منہ پر سج سکتی تھیں یا کم از کم ایسے حالات میں جن خیالات کا اظہار بیٹا ماں کی حالت غیر دیکھ کر کر سکتا تھا، ان بھی اس انداز گفتگو پر کچھ ہنسی دیتی ہے کہ کیوں کر بچہ ماں کو گیان دے رہا ہے تو

پھر یہ کہا کہ میں نے سنی سب یہ داستاں — لاکھوں برس کی عمر ہو دینے ہو ماں کو گیان
لیکن جو میرے دل کو ہے درپیش امتحاں — بچے ہو اس کا علم نہیں تم کو بے گماں

اس درد کا شریک تمہارا جگر نہیں
کچھ ممتا کی آنچ کی تم کو خبر نہیں

آخر ہے عمر ہے یہ میرا وقت واپسیں — کیا اعتبار آج ہوں دنیا میں کل نہیں
لیکن وہ دن بھی آئے گا اس دل کو ہے یقیں — سوچو گے جب کہ رونی تھی کیوں مادرِ حزیں

اولاد جب کبھی تمہیں صورت دکھائے گی
فریاد اس غریب کی تب یاد آئے گی

اور آخر میں رامچندر جی کا جواب۔ اور اس ساری داستان کی انتہا (climax)

دیکھئے ؎

بن باس پہ خوشی سے جو راضی نہ ہوں گا میں — کس طرح منہ دکھانے کے قابل رہوں گا میں
کیوں کر زبانِ غیر کے طعنے سنوں گا میں — دنیا جو یہ کہے گی تو پھر کیا کروں گا میں

لڑکے نے بےحیائی کو نقشِ جبیں کیا
کیا بے ادب تھا باپ کا کہنا نہیں کیا

تاثیر کا طلسم تھا معصوم کا خطاب — خود ماں کے دل کو چوٹ لگی سن کے یہ جواب
غم کی گھٹا سے ہٹ گئی تاریکی عتاب — چھاتی بھر آئی ضبط کی باقی رہی نہ تاب

سر کا کے پاؤں گود میں سر کو اٹھا لیا
سینہ سے اپنے لختِ جگر کو لگا لیا

دونوں کے دل بھر آئے ہوا اور ہی سماں — گنگ و جمن کی طرح سے آنسو ہوئے رواں

ہر آنکھ کو نصیب یہ اشکِ رواں کہاں ان آنسوؤں کا مول اگر ہے تو نقدِ جاں
ہوتی ہے ان کی قدر فقط دل کے راج میں
ایسا گہر نہ تھا کبھی دسرت کے تاج میں

"صبحِ وطن" کا ایک حصہ مراثی پر مشتمل ہے۔ یہ مرثیے شعرائے متقدمین کی طرح واقعۂ کربلا پر نہیں ہیں۔ ان مراثی میں چکبست نے اپنے سیاسی اور قومی لیڈروں کی موت پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے، ان کے محاسنِ ظاہری و باطنی کو اجاگر کیا ہے۔ شخصی مرثیوں کے رواج سے پہلے ہمیں سوداؔ کے یہاں "بلّی" اور "مرغ" کے مرنے پر شدید قسم کا اظہارِ افسوس ملتا ہے۔ "بلی" اور "مرغ" کے مرثیوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرثیہ کے معنی میں وسعت آگئی تھی اور اپنے عزیز جانوروں کی موت پر اظہارِ غم ہو سکتا تھا۔ لیکن شخصی مرثیے ہمیں غالبؔ و مومنؔ سے پہلے دکھائی نہیں دیتے، غالبؔ نے عارفؔ کی موت پر اور مومنؔ نے اپنی محبوبہ فاطمہ بیگم عرف پردہ نشین کی موت پر مرثیے لکھے تھے جن کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور
مٹ جائے گا سر، گر ترا پتھر نہ گھسے گا
ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور
جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور
ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

اور مومن کے مرثیہ کا ایک شعر دیکھئے ؎

پھرتی نہ تھی جو پردہ نشین گھر میں بے حجاب
نعش اس کی جائے ہے سرِ بازار ہائے ہائے

غالب و مومن کے بعد دورِ جدید میں شخصی مرثیہ کی ابتدا حالی سے ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں ان کا مرثیہ "غالب" اور "حکیم محمود" اور اقبال کے مراثی "غالب" اور "داغ" بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ حالی اور اقبال کے ان مراثی میں مرنے والوں پر افسوس اور آنسوؤں کا نذرانہ ہی نہیں بلکہ ان کی عظیم شخصیتوں کی سیرتوں کے لافانی مرقعے ہیں، چکبست نے بھی اس سلسلے میں ایک دو نہیں متعدد مرثیے لکھے ہیں، جن میں بشن نرائن در، تلک اور گوکھلے کے مرثیے اپنی اثر آفرینی، ٹیکنک، جذبات نگاری واقعیت و اصلیت اور روانی کی وجہ سے جو انیس کے اثر کے تحت چکبست کو ملی، اردو کے بہترین مرثیے ہیں، ان مرثیوں میں انیس کے انداز و بیان کی تقلید نے حسن اور خوبصورتی پیدا کی اور ان کی کامیابی اور اہمیت میں اضافہ ہو گیا۔ یہ مرثیے مرحومین کی سیرتوں کے پرکیف و حسین فن پارے ہیں، اگر ہر شخص کی سیرت کا مرقع ایک ہی انداز اور پیرایہ بیان کے ایک ہی طریقے پر پیش کیا جائے تو قاری کے ذہن پر اس کے اچھے اثرات نہیں پڑ سکتے ہمارے شاعر نے اس ذیل میں انسانوں کی نفسیاتی کمزوریوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہر مرثیہ میں الفاظ کا انتخاب، طرزِ بیان، بحروں کا استعمال اور سب سے زیادہ سیرتوں کو ایک دوسرے سے بالکل الگ الگ پیش کیا ہے۔ گوپال کرشن گوکھلے کے مرثیہ میں کہتے ہیں ؎

وطن کا عشق رہا دل کی آرزو ہو کر
رہا مزاج میں سودائے قوم خو ہو کر

رگوں میں جوشِ محبت ہے ہے لہو ہو کر بدن میں جان رہی وقفِ آبرو ہو کر
خدا کے حکم سے جب آب و گل بنا تیرا
کسی شہید کی مٹی سے دل بنا تیرا

اجل کے دام میں آنا ہے یوں تو عالم کو مگر یہ دل نہیں تیار تیرے ماتم کو
پہاڑ کہتے ہیں دنیا میں ایسے ہی غم کو مٹا کے تجھ کو اجل نے مٹا دیا ہم کو
جنازہ ہند کا در سے تیرے نکلتا ہے
سہاگ قوم کا تیری چتا میں جلتا ہے

"بال گنگا دھر تلک" کے مرثیہ کا بھی پہلا اور آخری بند دیکھتے چلیے ۔

روشنی صبحِ وطن کی ہے کہ ماتم کا غبار موت نے رات کے پردہ میں کیا کیسا وار
طنطنہ شیر کا باقی نہیں سونی ہے کچھار معرکہ سرد ہے سویا ہے وطن کا سردار
بیکسی چھائی ہے تقدیر پھری جاتی ہے
قوم کے ہاتھ سے تلوار گری جاتی ہے

اور

ہو جبیں کے لئے صندل کی جگہ خاکِ وطن لاش کو تیری سنواریں نہ رقیبانِ کہن
دیں اسی کا تجھے پنجاب کے مظلوم کفن تر ہوا ہے جو شہیدوں کے لہو سے دامن
شورِ ماتم نہ ہو جھنکار ہو زنجیروں کی
چاہئے قوم کے بھیشم کو چتا تیروں کی

چکبست نے محض حبِ وطن کے گیت سورمیروں اور لیڈروں کے مرثیہ اور قوم کے جہل و نفاق اور بغض و عناد کی تصویریں ہی نہیں کھینچی ہیں بلکہ فطرت کی منظرنگاری

بھی کی ہے۔ انھوں نے کائنات اور اپنے ماحول کا تفصیلی مطالعہ کیا تھا جس کے جستہ جستہ ٹکڑے ان کی شاعری میں مصورانہ بانکپن لیے ہوئے ہیں" رامائن کا ایک سین"، "وطن کا راگ"، "گوکھلے" غرض کوئی نظم ایسی نہیں ہے جس میں چکبست نے فطرت کی تصویریں پیش نہ کی ہوں، لیکن منظر نگاری کے سلسلے میں "سیر دیرہ دون" "برسات" اور "جلوۂ صبح" فطرت کی شاعری کے دلکش ادب پارے ہیں۔ سیر دہرہ دون" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

یہیں بہار کا پہلے پہل ہوا تھا شگون | عجیب خطۂ دلکش ہے شہر دہرہ دون
نگاہِ شوق نے کیا کہیے کیا سماں دیکھا | نئی زمین، نیا رنگ آسماں دیکھا
سنا جو کرتے تھے وہ باغ پر فضا یہی | اگر پہاڑ میں جنت تو راستہ ہے یہی
ازل میں تھی جو فضا اس کی یادگار ہے یہ | نشیب کوہ میں گہوارۂ بہار ہے یہ
گھنے درخت ہری جھاڑیاں زمیں شاداب | لطیف و سر دہوا پاک و صاف چشمۂ آب
کمی کبھی نہیں شادابیوں کے ساماں میں | ٹھہر گئی ہے بہار آ کے اس گلستاں میں
طلسم حسن کھلا ہے بیچ میں یہ گلدستہ | کھڑے ہیں کوہ و شجر پہلوؤں میں صف بستہ

یہاں جو آ کے مسافر قیام کرتے ہیں
یہ سنتری انھیں پہلے سلام کرتے ہیں

چکبست نے کہا تھا ؎

قدر داں کیوں مجھے تکلیفِ سخن دیتے ہیں
میں سخنور ہی نہیں، شاعر نہیں، استاد نہیں

لیکن جب ہم شاعر کا مطالعہ کرتے ہیں تو حقیقت اس کے برعکس نظر آتی ہے۔

چکبست تخلص کے گنہگار نہ ہوتے ہوئے بھی بزم شعرا میں انفرادی مقام رکھتے ہیں اور چکبست کے ذکر کے بغیر سخنوروں شاعروں اور استادوں کی فہرست نامکمل رہ جاتی ہے۔

چکبست کا یہ انتخاب "صبحِ وطن کی کیبابی اور ادب کے طالبعلموں کی ضرورتوں کے پیش نظر کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں کوشش کی گئی ہے کہ چکبست کے ہر رنگ کے شعر نظر کے سامنے رہیں تاکہ شاعر کے مطالعہ و میلان طبع کو جاننے کے سلسلے میں مواد ایک ہی جگہ پر مل جائے۔

عبدالستّار دلوی

بمبئی۔ ۱۵ر اگست ۱۹۶۰ء

خاکِ ہند

اے خاکِ ہند تیری عظمت پہ کیا گماں ہے
دریائے فیضِ قدرت تیرے لئے رواں ہے
تیری جبیں سے نورِ حسنِ ازل عیاں ہے
اللہ رے زیب و زینت کیا اوجِ عزوشاں ہے

ہر صبح ہے یہ خدمت خورشید پر ضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیا کی

اس خاکِ دلنشیں سے چشمے ہوئے وہ جاری
چین و عرب میں جن سے ہوتی تھی آبیاری

سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا ابر طاری
چشم و چراغ عالم تھی سرزمیں ہماری

شمع ادب نہ تھی جب یوناں کی انجمن میں
تاباں تھا مہر دانش اس وادئ کہن میں

گوتم نے آبرو دی اس معبدِ کہن کو
سرمد نے اس زمیں پر صدقے کیا وطن کو
اکبر نے جامِ اُلفت بخشا اس انجمن کو
سینچا لہو سے اپنے رانا نے اس، چمن کو

سب سور بیر اپنے اس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا ان کی ہڈیاں ہیں

دیوار و در سے اب تک اس کا اثر عیاں ہے
اپنی رگوں میں اب تک اس کا لہو رواں ہے
اب تک اثر میں ڈوبی ناقوس کی فغاں ہے
فردوس گوش اب تک کیفیتِ اذاں ہے

کشمیر سے عیاں ہے جنت کا رنگ اب تک
شوکت سے بہ رہا ہے دریائے گنگ اب تک

اگلی سی تازگی ہے پھولوں میں اور پھلوں میں
کرتے ہیں رقص اب تک طاؤس جنگلوں میں
اب تک وہی کڑک ہے بجلی کی بادلوں میں
پستی سی آگئی ہے پر دل کے حوصلوں میں

گل شمع انجمن ہے گو انجمن وہی ہے
حب وطن نہیں ہے خاکِ وطن وہی ہے

برسوں سے ہو رہا ہے برہم سماں ہمارا
دنیا سے مٹ رہا ہے نام و نشاں ہمارا
کچھ کم نہیں اجل سے خواب گراں ہمارا
اک لاشِ بے کفن ہے ہندوستاں ہمارا

علم و کمال و ایماں برباد ہو رہے ہیں
عیش و طرب کے بندے غفلت میں سو رہے ہیں

اے صورِ حبِ قومی اس خواب سے جگا دے
بھولا ہوا فسانہ کانوں کو پھر سنا دے
مردہ طبیعتوں کی افسردگی مٹا دے
اٹھتے ہوئے شرارے اس خاک سے دکھا دے

حبِّ وطن سمائے آنکھوں میں نور ہو کر
سر میں خمار ہو کر دل میں سرور ہو کر

شیدائے بوستاں کو سرو سمن مبارک
رنگیں طبیعتوں کو رنگِ سخن مبارک
بلبل کو گُل مبارک گُل کو چمن مبارک
ہم بیکسوں کو اپنا پیارا وطن مبارک

غنچے ہمارے دل کے اس باغ میں کھلیں گے
اس خاک سے اٹھے ہیں اس خاک میں ملیں گے

ہے جوئے شیر ہم کو نورِ سحر وطن کا
آنکھوں کی روشنی ہے جلوہ اس انجمن کا
ہے رشکِ مہر ذرّہ اس منزلِ کہن کا
تلتا ہے برگِ گُل سے کانٹا بھی اس چمن کا

گرد و غبار یاں کا خلعت ہے اپنے من کو
مر کر بھی چاہتے ہیں خاکِ وطن کفن کو

وطن کا راگ

زمین ہند کی رتبہ میں عرش اعلیٰ ہے
یہ ہوم رول کی امید کا اجالا ہے
مسز بسنت نے اس آرزو کو پالا ہے
فقیر قوم کے ہیں اور یہ راگ مالا ہے

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

وطن پرست شہیدوں کی خاک لائیں گے
ہم اپنی آنکھ کا سرمہ اسے بنائیں گے
غریب ماں کے لئے درد دکھ اٹھائیں گے
یہی پیام وفا قوم کو سنائیں گے

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

ہمارے واسطے زنجیر و طوق گہنا ہے
وفا کے شوق میں گاندھی نے جس کو پہنا ہے
سمجھ لیا کہ ہمیں رنج و درد سہنا ہے
مگر زباں سے کہیں گے وہی جو کہنا ہے

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

پنھانے والے اگر بیڑیاں پنھائیں گے
خوشی سے قید کے گوشہ کو ہم بسائیں گے
جو سنتری درِ زنداں کے سو بھی جائیں گے
یہ راگ گا کے انھیں نیند سے جگائیں گے

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

زباں کو بند کیا ہے یہ غافلوں کو ہے ناز
ذرا رگوں میں لہو کو بھی دیکھ لیں انداز
رہے گا جان کے ہمراہ دل کا سوز و گداز
چتا سے آئے گی مرنے کے بعد یہ آواز

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

یہی دعا ہے وطن کے شکستہ حالوں کی
یہی امنگ جوانی کے نونہالوں کی
جو رہنما ہے محبت پہ مٹنے والوں کی
ہمیں قسم ہے اسی کے سپید بالوں کی

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

یہی پیام ہے کوئل کا باغ کے اندر
اسی ہوا میں ہے گنگا کا زور آٹھ پہر
ہلالِ عید نے دی ہے یہی دلوں کو خبر
پکارتا ہے ہمالہ سے ابر اٹھ کر

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

بسے ہوئے ہیں محبت سے جن کی قوم کے گھر
وطن کا پاس ہے ان کو سہاگ سے بڑھ کر

جو شیر خوار ہیں ہندوستاں کے لختِ جگر
یہ ماں کے دودھ سے لکھا ہے ان کے سینہ پر

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

آوازۂ قوم

یہ خاکِ ہند سے پیدا ہیں جوش کے آثار
ہمالیہ سے اُٹھے جیسے ابرِ دریا بار
لہو رگوں میں دکھاتا ہے برق کی رفتار
ہوئی ہیں خاک کے پردہ میں ہڈیاں بیدار

زمیں سے عرش تلک شور ہوم رول کا ہے
شبابِ قوم کا ہے زور ہوم رول کا ہے

نگاہِ شوق ہے اس رنگ کی تماشائی
ہے جس سے شیخ و برہمن پہ بیخودی چھائی
ہر ایک گام پہ کرتے ہوئے جبیں سائی
چلے ہیں بہرِ زیارت وفا کے سودائی

وطن کے عشق کا بُت بے نقاب نکلا ہے
نئے افق پہ نیا آفتاب نکلا ہے

یہ آرزو ہے کہ مہر و وفا سے کام رہے
وطن کے باغ میں اپنا ہی انتظام رہے
گلوں کی فکر میں گلچیں نہ صبح و شام رہے
نہ کوئی مرغِ خوش الحاں اسیرِ دام رہے

سر پہ شاہ کا اقبال ہو بہارِ چمن
رہے چمن کا محافظ یہ تاجدارِ چمن

ہے آج کل کی ہوا میں وفا کی بربادی
سنے جو کوئی تو سارا چمن ہے فریادی
قفس میں بند ہیں جو آشیاں کے تھے عادی
اڑا ہے باغ سے بو ہو کہ رنگِ آزادی

ہوائے شوق میں غنچے بکس نہیں سکتے
ہمارے پھول بھی چاہیں تو ہنس نہیں سکتے

جو آج کل ہے محبت دسن کی عالمگیر
یہی گنہ ہے یہی جرم ہے یہی تقصیر
زباں ہے بند قلم کو پنہائی ہے زنجیر
بیانِ درد کی باقی نہیں کوئی تدبیر

ہے دل میں درد مگر طاقتِ کلام نہیں
لگے ہیں زخم تڑپنے کا انتظام نہیں

جو اپنے حال پہ یہ بے کسی برستی ہے
یہ نائبان حکومت کی خود پرستی ہے
یہاں سے دور جو برطانیہ کی بستی ہے
وہاں سنا ہے محبّت کی جنس سستی ہے

جو اس پہ حال وطن آشکار ہو جائے
یہ دیکھتے رہیں بیڑا یہ پار ہو جائے

فدائیان حکومت نے ہم کو رنج دیئے
مگر جو فرض وفا تھے ادا وہ ہم نے کئے
نثارِ جاں سے ہوئے داب سلطنت کے لئے
شرابِ عیش سمجھ کر لہو کے گھونٹ پیئے

ڈگے نہ پاؤں محبّت کے نوک خنجر پر
لہو کی مہر ہے اپنی وفا کے محضر پر

جو اپنے دل سے ہے برطانیہ کا دل راضی
تو کیا کریں گے یہ ہندوستان کے قاضی

نہ کام آئے گی غیروں کی رخنہ اندازی
نہیں پکار رہی ہے سخی کی فیّاضی
بچی کھچی پہ قناعت ہے یوں نہیں پینے
پلانے والا پلاتا ہے کیوں نہیں پینے

رہا ہے رات کی صحبت میں کیا مزا باقی
نگاہِ شوق کو ہے دورِ نو کی مشتاقی
نئی شراب نیا دور اور نیا ساقی
مٹے سرور میں دیر و حرم کی ناچاقی
یہی کسی کا حرم ہو کسی کا دیر رہے
یہ میکدہ رہے آباد خم کی خیر رہے

شرابِ شوق دوا ہے اس انجمن کے لئے
سرور اس کا ہے اکسیر روح تن کے لئے
کھنچی ہے خلد میں اس محفل کہن کے لئے
فلک سے اتری ہے یہ شیخ و برہمن کے لئے
رہے گا دور زمانہ میں یادگار اس کا
یہ ہوم رول کا سودا خمار ہے اس کا

اسی کے مست کہیں ہیں حرم پہ چھائے ہوئے
اذاں کے نعرۂ دلکش سے حظ اٹھائے ہوئے
کہیں ہے نغمۂ ناقوس دل لبھائے ہوئے
اسی فضا میں یہ سب راگ ہیں سمائے ہوئے
بہ حکم پیر مغاں کا ہے نشۂ مے میں
یہ راگ آ کے ملیں ہوم رول کی لے میں

رقیب کہتے ہیں رنگِ وطن نہیں یکساں
بنا ہے قوس قزاح خاکِ ہند کا داماں
جدھر نگاہ اُٹھے اس طرف نیا ہے سماں
نہ ایک رنگ طبیعت نہ ایک رنگ زباں
جو ہوم رول پہ بہ چشمِ شوق شیدا ہو
تمام رنگ میں ایک نور پیدا ہو

جو دل سے قوم کے نکلی ہے وہ دعا ہے یہی
تھا جس پہ ناز مسیحا کو وہ صدا ہے یہی
دلوں کو مست جو کرتی ہے وہ ہوا ہے یہی
غریب ہند کے آزار کی دوا ہے یہی

نہ چین آئے گا بے ہوم رول پائے ہوئے
فقیر قوم کے بیٹھے ہیں لَو لگائے ہوئے

یہ جوشِ پاک زمانہ دبا نہیں سکتا
رگوں میں خوں کی حرارت مٹا نہیں سکتا
یہ آگ وہ ہے جو پانی بجھا نہیں سکتا
دلوں میں آکے یہ ارمان جا نہیں سکتا

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

ہم ہونگے عیش ہوگا اور ہوم رول ہوگا

اہلِ وطن مبارک تم کو یہ بزمِ اعلیٰ
جس میں نئی امیدوں کا ہے نیا اجالا
دنیا کے مذہبوں سے یہ رنگ ہے نرالا
مسجد یہی ہے اپنی اور ہے یہی شوالا
ہو ہوم رول حاصل ارمان ہے تو یہ ہے
اب دین ہے تو یہ ہے ایمان ہے تو یہ ہے

شیدائے بوستاں کو سرو و سمن مبارک
رنگیں طبیعتوں کو رنگِ سخن مبارک
بلبل کو گل مبارک، گلی کو چمن مبارک
ہم بیکسوں کو اپنا پیارا وطن مبارک

ـــه یہ نظم لکھنؤ میں دسمبر ۱۹۱۶ء کی کانگریس کے اجلاس میں گائی گئی۔

غنچے ہمارے دل کے اس باغ میں کھلیں گے
اس خاک سے اُٹھے ہیں اس خاک میں ملیں گے

اِس خاکِ دل نشیں پہ بادل سا چھا رہا ہے
طوفان بے کسی کا ہم کو ستا رہا ہے
لیکن یہ دورِ حسرت دنیا سے جا رہا ہے
مایوس ہو نہ جانا وہ دن بھی آ رہا ہے

برطانیہ کا سایہ سر پر قبول ہوگا
ہم ہوں گے عیش ہوگا اور ہوم رول ہوگا

ہمارا وطن دل سے پیارا وطن

(چھوٹے بچوں کے لئے)

یہ ہندوستاں ہے ہمارا وطن　　محبت کی آنکھوں کا تارا وطن
"ہمارا وطن دل سے پیارا وطن"

وہ اس کے درختوں کی تیاریاں　　وہ پھل پھول پودے وہ پھلواریاں
"ہمارا وطن دل سے پیارا وطن"

ہوائیں درختوں کا وہ جھومنا　　وہ پتّوں کا پھولوں کا منہ چومنا
"ہمارا وطن دل سے پیارا وطن"

وہ ساون میں کالی گھٹا کی بہار　　وہ برسات کی ہلکی ہلکی پھوار
"ہمارا وطن دل سے پیارا وطن"

وہ باغوں میں کوئل وہ جنگل کے مور　　وہ گنگا کی لہریں وہ جمنا کا زور
"ہمارا وطن دل سے پیارا وطن"

اسی سے ہے اس زندگی کی بہار　　وطن کی محبت ہو یا ماں کا پیار
"ہمارا وطن دل سے پیارا وطن"

وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک

(بچوں کے لئے)

یہ پیاری انجمن ہم کو مبارک
یہ الفت کا چمن ہم کو مبارک
وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک

جہاں کی خاک ہم کو کیمیا ہے
یہ سونے سے بھی قیمت میں سوا ہے
وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک

جو چڑیاں صبح کو گاتی ہیں اکثر
اسی کا راگ ہے ان کی زباں پر
وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک

وہ ساون کے مہینے کی گھٹائیں
وہ کوئل اور پپیہے کی صدائیں
وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک

وہ اک مستی کا عالم بادلوں میں
وہ پھولوں کا مہکنا جنگلوں میں
وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک

وہ چشمے اور وہ امرت سا پانی
وہ گنگا اور جمنا کی روانی
وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک

درختوں پر وہ چڑیوں کا چہکنا وہ بیلے اور چنبیلی کا مہکنا
وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک

اسی کی خاک سے لیتے ہیں محصول یہی دیتا ہے غلّہ اور پھل پھول
وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک

وطن کا جن بزرگوں سے ہوا نام اسی مٹی میں وہ کرتے ہیں آرام
وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک

ہ

پھول مالا

(قوم کی لڑکیوں سے خطاب)

روشِ خام پہ مردوں کی نہ جانا ہرگز
داغ تعلیم میں اپنی نہ لگانا ہرگز

نام رکھا ہے نمائش کا ترقی و رفارم
تم اس انداز کے دھوکے میں نہ آنا ہرگز

رنگ ہے جس میں مگر بوئے وفا کچھ بھی نہیں
ایسے پھولوں سے نہ گھر اپنا سجانا ہرگز

نقل یورپ کی مناسب ہے مگر یاد رہے
خاک میں غیرتِ قومی نہ ملانا ہرگز

خود جو کرتے ہیں زمانہ کی روش کو بدنام
ساتھ دیتا نہیں ایسوں کا زمانہ ہرگز

خود پرستی کو لقب دیتے ہیں آزادی کا
ایسے اخلاق پہ ایمان نہ لانا ہرگز

رنگ و روغن ہے تمہیں یورپ کا مبارک لیکن
قوم کا نقش نہ چہرے سے مٹانا ہرگز

جو بناتے ہیں نمائش کا کھلونا تم کو
ان کی خاطر سے یہ ذلت نہ اٹھانا ہرگز

رُخ سے پردہ کو اُٹھایا تو بہت خوب کیا
پردۂ شرم کو دل سے نہ اُٹھانا ہرگز

تم کو قدرت نے جو بخشا ہے حیا کا زیور
مول اس کا نہیں قاروں کا خزانہ ہرگز

دل تمہارا ہے وفاؤں کی پرستش کیلئے
اس محبت کے شوالہ کو نہ ڈھانا ہرگز

پوجنے کے لئے مندر جو ہے آزادی کا
اس کو نفرت کا مرگھٹ نہ بنانا ہرگز

نقد اخلاق کا ہم نل کی طرح ہار چکے — تم ہو دمینتی یہ دولت نہ لٹانا ہرگز
خاک میں دفن ہیں مذہب کے پرانے پاکھنڈ — تم یہ سوتے ہوئے فتنے نہ جگانا ہرگز
اپنے بچوں کی خبر قوم کے مردوں کو نہیں — یہ ہیں معصوم انہیں بھول نہ جانا ہرگز
ان کی تعلیم کا مکتب ہے تمہارا زانو — پاس مردوں کے نہیں ان کا ٹھکانہ ہرگز
کاغذی پھول ولایت کے دکھا کر ان کو — دیس کے باغ سے نفرت نہ دلانا ہرگز
نغمۂ قوم کی لے جس میں سما ہی نہ سکے — راگ ایسا کوئی ان کو نہ سکھانا ہرگز
پرورش قوم کی دامن میں تمہارے ہوگی — یاد اس فرض کی دل سے نہ بھلانا ہرگز
گو بزرگوں میں تمہارے نہ ہوا سونت کا رنگ — ان ضعیفوں کو نہ ہنس ہنس کے رلانا ہرگز
ہوگا جو گرا آنکھ سے ان کی آنسو — بچپنے سے نہ یہ طوفان اٹھانا ہرگز
ہم تمہیں بھول گئے اس کی سزا پاتے ہیں — تم ذرا اپنے تئیں بھول نہ جانا ہرگز

کبھی کے دل میں ہے وفا کسی کی زباں میں تاثیر
نہ سنا ہے نہ سنو گی یہ فسانہ ہرگز

راماین کا ایک سین

(راجہ رامچندر کا ماں سے رخصت ہونا)

رخصت ہوا وہ باپ سے لیکر خدا کا نام
راہِ وفا کی منزلِ اوّل ہوئی تمام
منظور تھا جو ماں کی زیارت کا انتظام
دامن سے اشک پونچھ کے دل سے کیا کلام

اظہار بے کسی سے ستم ہوگا اور بھی
دیکھا ہمیں اداس تو غم ہوگا اور بھی

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نونہال
خاموش ماں کے پاس گیا صورتِ خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال
سکتا سا ہو گیا ہے یہ ہے شدّتِ ملال

تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویرِ سنگ ہے

کیا جانے کس خیال میں گم تھی وہ بے گناہ
نورِ نظر پہ دیدۂ حسرت سے کی نگاہ
جنبش ہوئی لبوں کو بھری ایک سرد آہ
لی گوشہ ہائے چشم سے اشکوں نے رخ کی راہ
چہرے کا رنگ حالتِ دل کھولنے لگا
ہر موئے تن زباں کی طرح بولنے لگا

آخر اسیرِ یاس کا قفلِ دہن کھلا
افسانۂ شدائدِ رنج و محن کھلا
اک دفترِ مظالمِ چرخِ کہن کھلا
وا تھا دہانِ زخم کہ بابِ سخن کھلا
دردِ دلِ غریب جو صرفِ بیاں ہوا
خونِ جگر کا رنگ سخن سے عیاں ہوا

رو کر کہا خموش کھڑے کیوں ہو میری جاں
میں جانتی ہوں جس لئے آئے ہو تم یہاں
سب کی خوشی یہی ہے تو صحرا کو ہو رواں
لیکن میں اپنے منہ سے نہ ہرگز کہوں گی ہاں

کس طرح بن میں آنکھوں کے تارے کو بھیج دوں
جوگی بنا کے راج دلارے کو بھیج دوں

دنیا کا ہو گیا ہے یہ کیسا لہو سپید
اندھا کئے ہوئے ہے زر و مال کی امید
انجام کیا ہو کوئی نہیں جانتا یہ بھید
سوچے بشر تو جسم ہو لرزاں مثالِ بید
لکھی ہے کیا حیاتِ[1] ابد ان کے واسطے
پھیلا رہے ہیں جال یہ کس دن کے واسطے

لیتی کسی فقیر کے گھر میں اگر جنم
ہوتے نہ میرے جان کو سامان یہ بہم
ڈستا نہ سانپ بن کے کچھ شوکت و حشم
تم میرے لال تھے مجھے کس سلطنت سے کم
میں خوش ہوں پھونک دے کوئی اس تخت و تاج کو
تم ہی نہیں تو آگ لگاؤں کی راج کو

---

[1] بھرت جی کی ماں کیکئی کی طرف اشارہ ہے جن کی ضد سے مجبور ہو کر راجہ دشرتھ نے رامچندر جی کو بن باس کا حکم دیا تھا اور بھرت جی کو اپنا ولیعہد مقرر کیا تھا۔

کن کن ریاضتوں سے گذارے ہیں ماہ و سال
دیکھی تمہاری شکل جب اے میرے نونہال
پورا ہوا جو بیاہ کا ارمان تھا کمال
آفت یہ آئی مجھ پہ ہوئے جب سفید بال
چھٹتی ہوں ان سے جو گ لیا جن کے واسطے
کیا سب کیا تھا میں نے اسی دن کے واسطے

ایسے بھی نامراد بہت آئیں گے نظر
گھر جن کے بے چراغ رہے آہ عمر بھر
رہتا مرا بھی نخلِ تمنّا جو بے ثمر
یہ جائے صبر تھی کہ دعا میں نہیں اثر
لیکن یہاں تو بن کے مقدر بگڑ گیا
پھل پھول لا کے باغِ تمنّا اُجڑ گیا

سرزد ہوئے تھے مجھ سے خدا جانے کیا گناہ
منجدھار میں جو یوں مری کشتی ہوئی تباہ
آتی نظر نہیں کوئی امن و اماں کی راہ
اب یاں سے کوچ ہو تو عدم میں ملے پناہ

تقصیر میری خالقِ عالم بحل کرے
آسان مجھ غریب کی مشکل اجل کرے

سن کر زہاں سے ماں کی یہ فریاد درد خیز
اس خستہ جاں کے دل پہ چلی غم کی تیغ تیز
عالم یہ تھا فریب کہ آنکھیں ہو اشک ریز
لیکن ہزار ضبط سے رونے سے کی گریز
سوچا یہی کہ جاں سے بیکس گذر نہ جائے
ناشاد ہم کو دیکھ کے ماں اور مر نہ جائے

پھر عرض کی یہ مادرِ ناشاد کے حضور
مایوس کیوں ہیں آپ الم کا ہے کیوں وفور
صدمہ شاق عالمِ پیری میں ہے ضرور
لیکن نہ دل سے کیجیے صبر و قرار دور
شاید خزاں سے شکل عیاں ہو بہار کی
کچھ مصلحت اسی میں ہے پروردگار کی

یہ جعل یہ فریب یہ سازش یہ شور و شر
ہونا جو ہے سب اس کے بہانے ہیں سر بسر

اسبابِ ظاہری ہیں نہ ان پر کرو نظر
کیا جانے کیا ہے پردۂ قدرت میں جلوہ گر
خاص اس کی مصلحت کوئی پہچانتا نہیں
منظور کیا اسے ہے کوئی جانتا نہیں

راحت ہو یا کہ رنج خوشی ہو کہ انتشار
واجب ہر ایک رنگ میں ہے شکرِ کردگار
تم ہی نہیں ہو کشتۂ نیرنگِ روزگار
ماتم کدہ میں دہر کے لاکھوں ہیں سوگوار
سختی سہی نہیں کہ اُٹھائی کڑی نہیں
دنیا میں کیا کسی پہ مصیبت پڑی نہیں

دیکھے ہیں اس سے بڑھ کے زمانے کے انقلاب
جن سے کہ بے گناہوں کی عمریں ہوئیں خراب
سوزِ دروں سے قلب و جگر ہو گئے کباب
پیری مٹی کسی کی کسی کا مٹا شباب
کچھ بن نہیں پڑا جو نصیبے بگڑ گئے
وہ بجلیاں گریں کہ بھرے گھر اُجڑ گئے

ماں باپ منہ ہی دیکھتے تھے جن کا ہر گھڑی
قائم تھیں جن کے دم سے اُمیدیں بڑی بڑی
دامن پہ جن کے گرد بھی اڑ کر نہیں پڑی
ماری نہ جن کو خواب میں بھی پھول کی چھڑی

محروم جب وہ گل ہوئے رنگِ حیات سے
اُن کو جلا کے خاک کیا اپنے ہاتھ سے

کہتے تھے لوگ دیکھ کے ماں باپ کا ملال
ان بیکسوں کی جان کا بچنا ہے اب محال
ہے کبریائی شان گزرتے ہی ماہ و سال
خود دل سے دردِ ہجر کا مٹتا گیا خیال

ہاں کچھ دنوں تو نوحہ و ماتم ہوا کیا
آخر کو رو کے بیٹھ رہے اور کیا کیا

پڑتا ہے جب غریب پہ رنج و محن کا بار
کرتا ہے اس کو صبر عطا آپ کردگار
مایوس ہو کے ہوتے ہیں انساں گناہ گار
یہ جانتے نہیں وہ ہے دانائے روزگار

انساں اس کی راہ میں ثابت قدم رہے
گردن وہی ہے امرِ رضا میں جو خم رہے

اور آپ کو تو کچھ بھی نہیں رنج کا مقام
بادِ سفر وطن میں ہم آئیں گے شاد کام
ہوتے ہیں بات کرنے میں چودہ برس تمام
قائم امید ہی سے ہے دنیا ہے جس کا نام
اور یوں کہیں بھی رنج و بلا سے مفر نہیں
کیا ہوگا دو گھڑی میں کسی کو خبر نہیں

اکثر ریاض کرتے ہیں پھولوں پہ باغباں
ہے دن کی دھوپ رات کی شبنم انھیں گراں
لیکن جو رنگ باغ بدلتا ہے ناگہاں
وہ گل ہزار پردوں میں جاتے ہیں رائیگاں
رکھتے ہیں جو عزیز انھیں اپنی جاں کی طرح
ملتے ہیں دستِ یاس وہ برگِ خزاں کی طرح

لیکن جو پھول کھلتے ہیں صحرا میں بے شمار
موقوف کچھ ریاض پہ ان کی نہیں بہار

دیکھو یہ قدرتِ چمن آرائے روزگار
وہ ابر و باد و برف ہیں رہتے ہیں برقرار
ہوتا ہے ان پہ فضل جو ربِّ کریم کا
موجِ سموم بنتی ہے جھونکا نسیم کا

اپنی نگاہ ہے کرم کارساز پر
صحرا چمن بنے گا وہ ہے مہرباں اگر
جنگل ہو یا پہاڑ، سفر ہو کہ ہو حضر
رہتا نہیں وہ حال سے بندے کے بےخبر
اس کا کرم شریک اگر ہے تو غم نہیں
دامانِ دشت دامنِ مادر سے کم نہیں

ماں کا جواب

یہ گفتگو ذرا نہ ہوئی ماں پہ کارگر
ہنس کر وفورِ یاس سے لڑکے پہ کی نظر
چہرہ پہ یوں ہنسی کا نمایاں ہوا اثر
جس طرح چاندنی کا ہو شمشان میں گذر

پنہاں جو بے کسی تھی وہ چہرہ پہ چھا گئی
جو دل کی مردنی تھی نگاہوں میں آ گئی

پھر یہ کہا کہ میں نے سنی سب یہ داستاں
لاکھوں برس کی عمر ہو دیتے ہو ماں کو گیاں
لیکن جو میرے دل کو ہے درپیش امتحاں
بچے ہو اس کا علم نہیں تم کو ہے گماں

اس درد کا شریک تمہارا جگر نہیں
کچھ مامتا کی آنچ کی تم کو خبر نہیں

آخر ہے عمر ہے یہ مرا وقتِ واپسیں
کیا اعتبار آج ہوں دنیا میں کل نہیں
لیکن وہ دن بھی آئیگا اس دل کو ہے یقیں
سوچو گے جب کہ روتی تھی کیوں مادرِ حزیں

اولاد جب کبھی تمہیں صورت دکھائے گی
فریاد اس غریب کی تب یاد آئے گی

ان آنسوؤں کی قدر تمہیں کچھ ابھی نہیں
باتوں سے جو بجھے یہ وہ دل کی لگی نہیں

لیکن تمہیں ہو رنج یہ میری خوشی نہیں
جاؤ سدھارو خوش رہو ہیں روکتی نہیں

دنیا میں بے حیائی سے زندہ رہوں گی میں
یا اللہ ہے میں نے تم کو تو دکھ بھی سہونگی میں

نشتر بنے رام کے لئے یہ حرفِ آرزو
دل ہل گیا سر کنے لگا جسم سے لہو
سمجھے جو ماں کے دین کو ایمان و آبرو
سننی پڑے اسے یہ خجالت کی گفتگو

کچھ بھی جواب بن نہ پڑا فکر و غور سے
قدموں پہ ماں کے گر پڑا آنسو کے طور سے

طوفان آنسوؤں کا زباں سے ہوا نہ بند
رک رک کے اس طرح ہوا گویا وہ دردمند
پہونچی ہے مجھ سے آپ کے دل کو اگر گزند
مرنا مجھے قبول ہے جینا نہیں پسند

جو بے وفا ہے مادرِ ناشاد کے لئے
دوزخ یہ زندگی ہے اس اولاد کے لئے

ہے دور اس غلام سے خود رائی کا خیال
ایسا گمان بھی ہو یہ میری نہیں مجال
گر سو برس بھی عمر کو میری نہ ہو زوال
جو دین آپ کا ہے ادا ہو یہ ہے محال

جاتا کہیں نہ چھوڑ کے قدموں کو آپ کے
مجبور کر دیا مجھے وعدہ نے باپ کے

آرام زندگی کا دکھاتا ہے سبز باغ!
لیکن بہارِ عیش کا مجھ کو نہیں دماغ!
کہتے ہیں جس کو دھرم وہ دنیا کا ہے چراغ
ہٹ جاؤں اس روش سے تو کُل میں لگے گا داغ

بے آبرو بہ بتس نہ ہو یہ ہراس ہے
جس گود میں پلا ہوں مجھے اس کا پاس ہے

بن باس پر خوشی سے جو راضی نہ ہوں گا میں
کس طرح منہ دکھانے کے قابل رہوں گا میں
کیوں کر زبانِ غیر کے طعنے سنوں گا میں
دنیا جو یہ کہے گی تو پھر کیا کروں گا میں

لڑکے نے بے حیائی کو نقشِ جبیں کیا
کیا بے ادب تھا باپ کا کہنا نہیں کیا

تاثیر کا طلسم تھا معصوم کا خطاب
خود ماں کے دل کو چوٹ لگی سن کے یہ جواب
غم کی گھٹا سے ہٹ گئی "تاریکیِ عتاب"
چھاتی بھر آئی ضبط کی باقی رہی نہ تاب

سرکا کے پاؤں گود میں سر کو جھکا لیا
سینہ سے اپنے لختِ جگر کو لگا لیا

دونوں کے دل بھر آئے ہوا اور ہی سماں
گنگ و جمن کی طرح سے آنسو ہوئے رواں
ہر آنکھ کو نصیب یہ اشکِ وفا کہاں
ان آنسوؤں کا مول اگر ہے تو نقدِ جاں

ہوتی ہے ان کی قدر فقط دل کے راج میں
ایسا گہر نہ تھا کوئی دسرت کے راج میں

~ ٭ ~

گائے

تو وہ مخلوق ہے خلقت میں نہیں جس کی گناہ
لی ہے قالب میں ترے روح محبّت نے پناہ
تیری صورت سے عیاں ہوتی ہے انساں کی چاہ
رس بھری آنکھ سموئی ہوئی امرت میں نگاہ
نقش ہے دل پہ مرے موہنی صورت تیری
خوب دنیا کے شوالے میں ہے مورت تیری

تن سے تیرے ہے عیاں نرمیٔ دل کا جوہر
جوڑ بند ایسے کہ سانچے میں بنے ہیں ڈھل کر
رنگ کالا ہو کہ اجلا ہو یہ کہتی ہے نظر
بندرابن کی وہ ہے شام یہ متھرا کی سحر
کنگرے سے یہ نہیں چہرۂ نورانی پر
تاج قدرت نے سجایا ہے تیری پیشانی پر

دیکھے جنگل میں کوئی شام کو تیری رفتار
ہے پئے جیسے کسی کو ہو جوانی کا خمار
مست کر دیتی ہے شاید تجھے قدرت کی بہار
وہ اترتی ہوئی دھوپ اور وہ سبزے کا نکھار
ایک ایک گام پہ شوخی سے مچلنا تیرا
کھا کے جنگل کی ہوا جھوم کے چلنا تیرا

صاحبِ دل تجھے تصویرِ وفا کہتے ہیں
چشمۂ فیض خدا مردِ خدا کہتے ہیں
دردمندوں کی مسیحا شعرا کہتے ہیں
ماں تجھے کہتے ہیں ہندو تو بجا کہتے ہیں
کوئی ہے جس نے ترے دودھ سے منہ پھیرا ہے
آج اس قوم کی رگ رگ میں لہو تیرا ہے

نام جس کا ہے محبّت وہ ہے ایماں تیرا
کوئی ہو سب کے لئے فیض ہے یکساں تیرا
زندگی کے لئے محتاج ہے انساں تیرا
کوئی بیمار نہیں بندۂ احساں تیرا

خلق میں دودھ سے تیرے جو تری رہتی ہے
خشک ٹہنی تنِ لاغر کی ہری رہتی ہے

صورتیں یاد ہیں ان بچّوں کی پیاری پیاری
زندگی کی جنھیں ایک ایک گھڑی تھی بھاری
تیرے دم سے نہ رہی یاس کی حالت طاری
ہوگئیں ان کے لئے دودھ کی نہریں جاری
کتنے گرتے ہوئے پودوں کو سنبھالا تو نے
ماں جنھیں چھوڑ چلی تھی انھیں پالا تو نے

تیرے بچّوں نے کیا اپنی نیتیں ہم پہ نثار
اپنی گردن پہ لیا پرورشِ قوم کا بار
نظر آتی ہے جو ہر فصل میں کھیتی تیّار
ہے یہ سب ان کے لہو اور پسینے کی بہار
اُن کو منظور نہ ہوتا جو مٹانا اپنا
ہند کی خاک اگلتی نہ خزانہ اپنا

اہلِ دیں نے تجھے جنّت کا سہارا سمجھا
اپنے ایمان کی قسمت کا ستارا سمجھا

سور بیروں نے تجھے جان سے پیارا سمجھا
تجھکو اکبرؔ نے سدا آنکھ کا تارا سمجھا

آبرو قوم کی ہے تیری نگہبانی پر
یہی دو حرف لکھے ہیں تیری پیشانی پر

مثل بچوں کے تیرے دودھ کے ہیں متوالے
جو ضعیفی سے پڑے رہتے ہیں بستر ڈالے
مست رہتے ہیں ترے فیض سے کس بل والے
پیار سے کہتے ہیں "ماتا" تجھے بچے بالے

تیری الفت سے انھیں منہ نہیں موڑا جاتا
تیری صورت کا کھلونا نہیں توڑا جاتا

میرے دل میں ہے محبت کا تیری سرمایہ
ماں کے دامن سے ہے بڑھ کر مجھے تیرا سایہ
یاد ہے فیضِ طبیعت نے جو تجھ سے پایا
عین قسمت کا جو تیرا نام زباں پر آیا

اس حلاوت سے جو دعوائے سخن گوئی ہے
دودھ سے تیرے لڑکپن میں زباں دھوئی ہے

سیرِ دیرہ دون

یہیں بہار کا پہلے پہل ہوا تھا شگون
عجیب خطّہ، دلکش ہے شہرِ دیرہ دون

نگاہِ شوق نے کیا کہیے کیا سماں دیکھا
نئی زمین نیا رنگ آسماں دیکھا

سنا جو کرتے تھے وہ باغِ پُر فضا ہے یہی
اگر پہاڑ ہیں جنّت تو راستہ ہے یہی

ازل میں تھی جو فضا اس کا یادگار ہے یہ
نشیبِ کوہ میں گہوارۂ بہار ہے یہ

کیا نہیں اسے غارت بشر کی صنعت نے
یہ سبزہ زار سجایا ہے دستِ قدرت نے

سپردِ ابر کے ہے انتظام پانی کا
ہوائے سرد کو ہے حکم باغبانی کا

تمام شہر ہے گرد و غبار سے خالی
جدھر نگاہ اٹھے اس طرف ہے ہریالی

لباس پہنے ہیں کل خشت و سنگ سبزہ کا
بجائے خاک کے اڑتا ہے رنگ سبزہ کا

اثر خزاں کا ہو کیا تازگی کے مسکن میں
پہاڑ اس کو چھپائے ہیں اپنے دامن میں

گھنے درخت، ہری جھاڑیاں، زمیں شاداب
لطیف و سرد ہوا پاک و صاف چشمہ آب

کمی کبھی نہیں شادابیوں کے ساماں میں
ٹھہر گئی ہے بہار آ کے اس گلستاں میں

طلسم حسن کا ہے بیچ بیچ میں یہ گلدستہ
کھڑے ہیں کوہ و شجر پہلوؤں میں سربستہ

یہاں جو آ کے مسافر مقام کرتے ہیں
یہ سنتری انھیں پہلے سلام کرتے ہیں

جو دور جائیے بستی ہے اور ہی ہے سماں
یہ سوچتا ہے پہاڑوں کو دیکھ کر انساں

بشر پہ رعب یہ قدرت کا چھا گیا کیسا
یہ بل زمین کی تیوری پہ آ گیا کیسا

بلندیوں سے جو ہو مائل نشیب نظر
فریب دیتا ہے ندّی کا پیچ و خم اکثر

نگہ کو دور سے پانی جو ہے نظر آتا
سپید ناگ چلا جا رہا ہے بل کھاتا

قریب ہوتا ہے آخر یہ دُور کا عالم
نگاہ دیکھتی ہے پھر سرُور کا عالم

فضائے کوہ میں ایسی ہوا سمائی ہے
بشر کی روح کو راحت کی نیند آئی ہے

بس ایک عالمِ ہو چار سمت طاری ہے
نہ شور شر ہے نہ دنیا کی آہ و زاری ہے

اثر دکھاتا ہے قدرت کا نغمۂ دلگیر!
شجر حجر سے ٹپکتی ہے راگ کی تاثیر!

یہ راگ وہ ہے جو مضراب کا اسیر نہیں
یہ صرف کان کے پردوں میں گوشہ گیر نہیں

وہی سنے گا اسے دل گداز ہے جس کا!
ہو دل میں سوز تو رگ رگ میں ساز ہو اس کا!

یہ راگ مجھ میں سمایا سرورِ مے ہو کر!
ہوس تھی روح کو مل جائے اس میں لے ہو کر

حریم خاص میں قدرت کی باریابی تھی!
نگاہِ شوق میں اک شانِ بیحجابی تھی

نشست سنگ پہ تھی سایۂ شجر کے تلے
رواں تھا چشمۂ آبِ خنک نظر کے تلے

شریکِ حال تھی وضع قدیم قدرت کی
عیاں تھی سنگ و شجر سے کشش محبت کی

شرابِ انسِ حقیقی سے تھا ہر اک سرشار
شجر تھا کوہ تھا چشمہ تھا یا یہ مشت غبار

درخت و کوہ ہیں کیا ذات پات انساں کیا
طیور کیا ہیں ہوا کیا ہے ابر و باراں کیا

یہ موج ہستی بیدار کے عناصر ہیں
سب ایک قافلۂ شوق کے مسافر ہیں

یہ دل کے ٹکڑے ہیں قدرت کے ان میں بیر نہیں
سب ایک گود کے پالے ہیں کوئی غیر نہیں

انھیں سے نغمۂ قدرت ہے اوج و پستی میں
سب ایک ساز کے پردے ہیں بزم ہستی ہیں

جدا کسی سے بھی ہستی کا اپنی راز نہیں
کچھ آبشار میں اور ہم میں امتیاز نہیں

ہے جسم خاک یہاں اس کا جسم پانی ہے
جو روح ہم میں ہے اس میں وہی روانی ہے

اسی خیال سے طبع لطیف تھی سرشار
کچھ ایسی بے خبری تھی کہ ہوش اس پہ نثار

دل اپنے رنگ میں بیتاب تھا اس ارماں سے
کہ اس فضا میں ہو آزاد روح زنداں سے

اجل جو آئے تو اس کوہسار کے نیچے
بنے مزار کسی آبشار کے نیچے

غرض کہ روح کی آنکھوں سے یہ سماں دیکھا
ازل کے دن جو چھٹا تھا وہ آشیاں دیکھا
نیا سرور میسّر ہوا سفر کر کے
مگر نہ سیرِ چمن کر سکے نظر بھر کے
نصیبِ دل کو رہا ایسے میزباں[۱] سے نیاز
کہ جس کی ذات پہ ہے خاکِ دیرہ دوں کو ناز

وہ ذات کیا ہے کہ تصویر ہے محبّت کی
اسی سے شرم ہوئی لفظ آدمیّت کی

۱ؔ پنڈت آنند نرائن تنخواہ دار ۔ وکیل دیرہ دون ۔

بشن نرائن در

صدمۂ عام یہ ہے قوم کا پیارا نہ رہا
بے زبانوں کی زبان دل کا سہارا نہ رہا
گلشنِ علم و ادب کا چمن آرا نہ رہا
مطلعِ دانش و بینش کا ستارا نہ رہا

سب یہ غم ایک طرف ایک طرف غم اپنا
جس سے دنیا نہیں واقف وہ ہی ماتم اپنا

ہم نے دیکھے ہیں ترے اشکِ محبت اکثر
جن پہ صدقے ہیں زباں اور قلم کے جوہر
دو نگینے تھے خمینٌ کے ترے قلب و جگر
ہوئی غیروں کو نہ اُس پاک خزانے کی خبر

ظاہری حسنِ لیاقت کے یہ دیوانے ہیں
شمع دیکھی نہیں فانوس کے پروانے ہیں

دولتِ علم و ہنر سے نہیں دنیا خالی
بزمِ عالم کی یہ رونق نہیں جانے والی
پر ہے کمیاب وہ جوہر وہ سرشتِ عالی
آدمیت کی بنا جس نے ازل میں ڈالی

کچھ بڑی بات نہیں فاضلِ دوراں ہونا
آدمی کے لئے معراج ہے انساں ہونا

آدمیت کی یہ تصویر مٹی جاتی ہے
حسنِ اخلاق کی تدبیر مٹی جاتی ہے
جذبۂ خیر کی توقیر مٹی جاتی ہے
ہم مٹے جاتے ہیں تقدیر مٹی جاتی ہے

دلِ مایوس محبت کا عزاخانہ ہے
اپنی آنکھوں میں یہ دنیا نہیں ویرانہ ہے

ہے نظر میں تری ہستی کے ستارہ کا زوال
وہ شبِ غم کی سیاہی وہ مرض کا بھونچال
تب بھی سودائے وطن تھا ترے جینے کا مآل
خوف کہتے ہیں کسے موت کا آیا نہ خیال

کاہشِ تن سے طبیعت کی جِلا کم نہ ہوئی
روشنی شمع کی گھلنے سے ذرا کم نہ ہوئی

تجھ کو یوگی کہوں یا عالمِ بالا کا سفیر
تھا الگ اصلِ جہاں سے تری مٹی کا خمیر
آنچ دنیائے دنی کی جو رہی دامن گیر
کیا سبق روح کو لینا تھا یہاں رہ کے اسیر
کیا اسی طرح سے فطرت کی صفا ممکن تھی
کیا اسی آگ میں جلنے سے جِلا ممکن تھی

روشِ عام سے تجھ کو نہ سروکار رہا
جوہرِ خاص کا ہستی سے طلب گار رہا
گو کہ جنجال میں دنیا کے گرفتار رہا
اپنے دامن کو سمیٹے ہوئے ہشیار رہا
رنگِ دنیا سے رہا عالمِ فانی میں جدا
جیسے لہروں سے کنول رہتا ہے پانی میں جدا

تجھ کو معلوم نہ تھا دولتِ دنیا کیا ہے
حرص کیا شئے ہے زر و مال کا سودا کیا ہے

خودپرستی کا زمانہ میں تقاضا کیا ہے
عیش کیا چیز ہے راحت کی تمنا کیا ہے
تو نہ سمجھا کبھی غیروں کی مدد کے غم میں
اپنی راحت کا بھی سامان ہی اس عالم میں

کارِ دنیا میں گرفتار رہیں جو دنیادار
ان کو دیکھا ہے تری بے خبری سے بیزار
تو کہاں اور کہاں اُن کی نظر کا معیار
پھول جو ان کے لئے ہیں وہ تجھے تھے خس و خار

لطف اس بے خبری کا وہ اٹھائیں کیوں کر
خاک میں لوٹتے ہیں عرش پہ جائیں کیوں کر

خلعتِ نور طبیعت کو دیا قدرت نے
آبرو علم نے دی ظرف دیا غیرت نے
خودپسندی کو گوارا نہ کیا عادت نے
سات پردوں سے نکالا تجھے خود شہرت نے

تو مگر جوہرِ ذاتی کو دباتا ہی رہا
اپنے دامن میں چراغ اپنا چھپاتا ہی رہا

شہرۂ عام کو سمجھا نہ لیاقت کا صلا
نکتہ چینوں سے شکایت نہ رقیبوں سے گلا
دیدۂ غیر میں کھٹکی نہ طبیعت کی جلا
تو زمانہ سے مہِ نو کی طرح جھک کے ملا
عاجزی دل کی جھلکتی رہی پیشانی سے
تو وہ دریا تھا جو واقف نہیں طغیانی سے

دل محبت پہ فدا آنکھ مروت سے غنی
تجھ کو دشمن کی بھی منظور نہ تھی دل شکنی
مگر انصاف کے حق میں ہوا گر نیش زنی
پھر نہ تھا تجھ سے زیادہ کوئی جرأت کا دھنی
شیر نر معرکۂ عام کی سرگرمی میں
طفلِ معصوم سے ملتا ہوا دل نرمی میں

آج کل مہر و وفا میں ہے تجارت کی ادا
کوئی بیکس کا نہیں دوست بجز ذاتِ خدا
یوں ہوا کرتے ہیں یارانِ کہن دل سے جدا
جیسے پتوں سے گرا دیتی ہے پانی کو ہوا

جس کا اقبال زمانہ میں چمک جاتا ہے
اس کو بچپن کے رفیقوں سے حجاب آتا ہے

نہ ہوا فرق ترے رنگِ محبت میں عیاں
دھوپ دولت کی رہی یا رہی افلاس کی چھاں
تیری خدمت سے ہوا احباب کی مشکل آساں
دین تیرا تھا یہی اور یہی تیرا ایماں

ایک ہی وضع رہی ایک ہی انداز رہا
اپنے پیاروں کی غلامی پہ تجھے ناز رہا

بدنصیب ایسے بھی ہیں تجھ سے جو بیزار رہے
آکے دنیا میں فقط تیرے دل آزار رہے
ایسے بے درد زمانہ کے گنہگار رہے
مگر احسان سے تیرے نہ سبکسار رہے

اُن کو شرمندہ کیا تو نے محبت کر کے
خود گنہگار ہوئے تجھ سے عداوت کر کے

دل ہو تیرا سا تو دنیا کی حقیقت کیا ہے
تن پرستی پہ جو ہو صرف وہ دولت کیا ہے

غیر کو جس سے نہ راحت ہو وہ راحت کیا ہے
جس میں سودا نہ ہو کچھ بھی وہ طبیعت کیا ہے
زندگی یوں تو فقط بازیٔ طفلانہ ہے
مرد وہ ہے جو کسی رنگ میں دیوانہ ہے

۴

گوپال کرشن گوکھلے

لرز رہا تھا وطن جس خیال کے ڈر سے
وہ آج خوں رلاتا ہے دیدۂ تر سے
صدا یہ آتی ہے پھل پھول اور پتھر سے
زمیں پہ تاج گرا قوم ہند کے سر سے

حبیب قوم کا دنیا سے یوں روانہ ہوا
زمیں الٹ گئی کیا منقلب زمانہ ہوا

بڑھی ہوئی تھی نحوست زوال پیہم کی
ترے ظہور سے تقدیر قوم کی چمکی
نگاہ یاس تھی ہندوستاں پہ عالم کی
عجیب شے تھی مگر روشنی ترے دم کی

تجھی کو ملک میں روشن دماغ سمجھے تھے
تجھے غریب کے گھر کا چراغ سمجھے تھے

وطن کو تو نے سنوارا کس آب و تاب کے ساتھ
سحر کا نور بڑھے جیسے آفتاب کے ساتھ
چُنے رفاہ کے گل حسن انتخاب کے ساتھ
شباب قوم کا چمکا ترے شباب کے ساتھ
جو آج نشو و نما کا نیا زمانہ ہے
یہ انقلاب تری عمر کا فسانہ ہے

رہا مزاج میں سودائے قوم خو ہو کر
وطن کا عشق رہا دل کی آرزو ہو کر
بدن میں جان رہی وقف آبرو ہو کر
رگوں میں جوشِ محبت رہے لہو ہو کر
خدا کے حکم سے جب آب و گل بنا تیرا
کسی شہید کی مٹی سے دل بنا تیرا

وطن کی جان پہ کیا کیا تباہیاں آئیں
امنڈ امنڈ کے جہالت کی بدلیاں آئیں
چراغِ امن بجھانے کو آندھیاں آئیں
دلوں میں آگ لگانے کو بجلیاں آئیں

اس انتشار میں جس نور کا سہارا تھا
افق پہ قوم کے وہ ایک ہی ستارہ تھا

حدیثِ قوم بنی تھی تری زباں کے لئے
زباں ملی تھی محبت کی داستاں کے لئے
خدا نے تجھ کو پیمبر کیا یہاں کے لئے
کہ تیرے ہاتھ میں ناقوس تھا اذاں کیلئے

وطن کی خاک تری بارگاہِ اعلیٰ ہے
ہمیں یہی نئی مسجد نیا اجالا ہے

غریب ہند نے تنہا نہیں یہ داغ سہا
وطن سے دور بھی طوفاں رنج و غم کا اٹھا
حبیب کیا ہیں حریفوں نے یہ زباں سے کہا
سفیرِ قومِ جگر بندِ سلطنت نہ رہا

پیام شہ نے دیا رسم تعزیت کے لئے
کہ تو ستون تھا ایوانِ سلطنت کے لئے

دلوں پہ نقش ہیں اب تک تری زباں کے سخن
ہماری راہ میں گویا چراغ ہیں روشن

فقیر تھے جو ترے در کے خادمانِ وطن
انھیں نصیب کہاں ہوگا اب ترا دامن
ترے الم میں وہ اس طرح جان کھوتے ہیں
کہ جیسے باپ سے چھٹ کر یتیم روتے ہیں

اجل کے دام میں آنا ہے یوں تو عالم کو
مگر یہ دل نہیں تیار ترے ماتم کو
پہاڑ کہتے ہیں دنیا میں ایسے ہی غم کو
مٹا کے تجھ کو اجل نے مٹا دیا ہم کو

جنازہ ہند کا در سے ترے نکلتا ہے
سہاگ قوم کا تیری چتا میں جلتا ہے

رہے گا رنج زمانہ میں یادگار ترا
وہ کون دل ہے کہ جس میں نہیں مزار ترا
جو کل رقیب تھا ہے آج سوگوار ترا
خدا کے سامنے ہے ملک شرمسار ترا

پلی ہے قوم ترے سایۂ کرم کے تلے
ہمیں نصیب تھی جنت ترے قدم کے تلے

بال گنگادھر تلک

موت نے رات کے پردے میں کیا کیسا وار
روشنی صبح وطن کی ہے کہ ماتم کا غبار
معرکہ سرد ہے سویا ہے وطن کا سردار
طنطنہ شیر کا باقی نہیں سونی ہے کچھار
بے کسی چھائی ہے تقدیر بھری جاتی ہے
قوم کے ہاتھ سے تلوار گری جاتی ہے

اٹھ گیا دولتِ ناموس وطن کا وارث
قوم مرحوم کے اعزاز کہن کا وارث
جاں نثارِ ازلی شیرِ دکن کا وارث
پیشواؤں کے گرجتے ہوئے رن کا وارث
تھی سمائی ہوئی پونا کی بہار آنکھوں میں
آخری دور کا باقی تھا خمار آنکھوں میں

موت بھر اشت کی نھی یا تری مرنے کی خبر
مردنی چھا گئی انسان تو کیا پتھر پر
پتیاں جھک گئیں مرجھا گئے صحرا کے شجر
رہ گئے جوش میں بہتے ہوئے دریا تھم کر
سرد و شاداب ہوا رگ گئی کہساروں کی
روشنی گھٹ گئی دو چار گھڑی تاروں کی

تھا نگہبان وطن دبدبۂ عام ترا
نہ پڑے کیوں پاؤں یہ تھا قوم کو پیغام ترا
دل رقیبوں کے لرزتے تھے یہ تھا کام ترا
نیند سے چونک پڑے سن جو لیا نام ترا
یاد کر کے تجھے مظلوم وطن روئیں گے
بندۂ رسم جفا چین سے اب سوئیں گے

زندگی تیری بہار چمنستانِ وفا
آبرو تیرے لیے قوم سے پیمانِ وفا
عاشقِ نام وطن کشتۂ ارمانِ وفا
مردِ میدانِ وفا جسمِ وفا جانِ وفا

ہو گئی نذرِ وطن ہستیِ فانی تیری
نہ تو پیری رہی تیری نہ جوانی تیری

اوجِ ہمت پہ رہا تیری وفا کا خورشید
موت کے خوف پہ غالب رہی خدمت کی امید
بن گیا قید کا فرمان بھی راحت کی نوید
ہوئے تاریکیٔ زنداں میں ترے بال سپید

پھر رہا ہے مری نظروں میں سراپا تیرا
آہ وہ قیدِ ستم اور بڑھاپا تیرا

معجزہ اشکِ محبت کا دکھایا تو نے
ایک قطرہ سے یہ طوفان اٹھایا تو نے
ملک کو ہستیٔ بیدار بنایا تو نے
جذبۂ قوم کے جادو کو جگایا تو نے

اک تڑپ آ گئی سوتے ہوئے ارمانوں میں
بجلیاں کوند گئیں قوم کے ویرانوں میں

لاش کو تیری سنواریں نہ رقیبانِ کہن
ہو جبیں کے لئے صندل کی جگہ خاکِ وطن

تر ہوا ہے جو شہیدوں کے لہو سے دامن
دیں اسی کا تجھے پنجاب کے مظلوم کفن
شور ماتم نہ ہو جھنکار ہو زنجیروں کی
چاہیے قوم کے بھیشم کو چتا تیروں کی

کشمیر

پانی میں ہے چشموں کے اثر آبِ بقا کا
ہر نخل یہ عالم خضر سبز قبا کا
جو پھول ہے گلشن میں وہ ہے نورِ خدا کا
سائے میں شجر کے ہے اثر ظلِ ہما کا

مبدا ہے کرمِ عام کی ہر جوئے رواں ہے
سرچشمۂ فیض چمن آرائے جہاں ہے

وہ موج ہوا کا حرکت ابر کو دینا
چشموں سے پہاڑوں کے وہ اڑتا ہوا پینا
گاتے ہوئے ملاحوں کا وہ کشتیاں کھینا
ڈل[1] کا وہ سرِ شام ادھر کروٹیں لینا

وہ عکس چراغوں کا جھلکتا نظر آنا
پانی کا ستارہ بھی چمکتا نظر آنا

[1] ایک جھیل کا نام ہے۔

ہر لالۂ کہسار ہے تشکیلِ گلِ راحت!
داغ اس کے ہیں خالِ رخِ جویائے مسرت
کیا سبزۂ خوش رنگ ہے سرمایۂ عشرت
دل کے لئے ٹھنڈک ہے جگر کے لئے فرحت
ایسا نہیں قدرت نے کیا فرش کہیں پر
اس رنگ کا سبزہ ہی نہیں روئے زمیں پر

وہ صبح کو کہسار کے پھولوں کا مہکنا
وہ جھاڑیوں کی آڑ میں چڑیوں کا چہکنا
گردوں پہ شفقِ کوہ پہ لالے کا مہکنا
مستوں کی طرح ابر کے ٹکڑوں کا بہکنا
ہر پھول کی جنبش سے عیاں ناز پری کا
چلنا وہ دبے پاؤں نسیمِ سحری کا"

وہ طائرِ کہسار لبِ چشمۂ کہسار
وہ سرد ہوا گرم ابر گہر بار
وہ میوۂ خوش رنگ وہ سرسبز چمن زار
اِک آن میں صحت ہو جو برسوں کا ہو بیمار

یہ باغِ وطن روکشِ گلزارِ جناں ہے
سرمایۂ نازِ چمن آرائے جہاں ہے

ہے خطۂ سرسبز ہیں اک نور کا عالم
ہر شاخ و شجر پر شجرِ طور کا عالم
پروین ہے یہ ہے خوشۂ انگور کا عالم
ہر خار پہ بھی ہے مژۂ طور کا عالم

نکلے نہ صدا ایسی مغنّی کے گلو سے
آتی ہے جو آوازِ ترنّم لبِ جو سے

میووں سے گرانبار وہ اشجار کے ڈالے
بکھرے ہوئے وہ دامنِ کہسار پہ لالے
اڑتے ہوئے بالائے ہوا برف کے جھالے
دیکھے جو کوئی دور سے ہیں روئی کے گالے

وہ ابر کے لکّوں کا تماشہ شجروں میں
جھرنوں کی صدائیں وہ پہاڑوں کے درّوں میں

چھوٹے ہوئے اس باغ کو گذرا ہے زمانا
تازہ ہے مگر اس کی محبت کا فسانا

عالم نے شرف جن کی بزرگی کا ہی مانا
اٹھے نتھے اسی خاک سے وہ عالم و دانا
تن جن کا ہے پیوند اب اس پاک زمیں کا
رگ رگ میں ہماری ہے رواں خون انہیں کا

ہاں میں بھی ہوں بلبل اُسی شاداب چمن کا
ہے چشمۂ فردوس یہ عالم ہے دہن کا
کس طرح نہ سرسبز ہو گلزار سخن کا
ہے رنگ طبیعت میں چمن زار وطن کا
تازہ ہیں مضامیں بھی طبیعت بھی ہری ہے
ہاں گلشنِ قومی کی ہوا سر میں بھری ہے

دولت

کہتے تھے برا زر کو سخن سنج پرانے
اُن لوگوں کے ہمراہ گئے ان کے زمانے
وہ فلسفہ و علم و ادب سب ہیں فسانے
بدلا ہے نیا رنگ زمانے کی ہوا نے

دولت ہی ہے اب زینتِ کاشانۂ تہذیب
کہتے ہیں اسے شمعِ جلوخانۂ تہذیب

مٹ جانے پہ بھی نام و نشاں رہتا ہے اس سے
سرچشمۂ امید رواں رہتا ہے اس سے
تازہ چمنِ تاب و تواں رہتا ہے اس سے
پیری میں بھی انسان جواں رہتا ہے اس سے

ہر رنگ میں یہ تازگیِ قلب و جگر ہے
ہے صلح میں شمشیر لڑائی میں سپر ہے

کوشش کبھی زردار کی جاتی نہیں بے سود
رہتا ہے سدا سایہ فگن طالع مسعود

انساں کی نیّت میں اگر شر نہ ہو موجود
رہ رہ نہیں اس کے ہے کلید درِ مقصود
کب گوہرِ اُمیّد کو رولا نہیں اس نے
تھا کون سا در بند جو کھولا نہیں اس نے

ہوں طالب تحقیق کہ دل دادہ تعلیم
خم سامنے دولت کے ہے سب کا سرِ تسلیم
سنتے ہیں انھیں کے لئے ہیں کوثر و تسنیم
یاں جو رہِ مولا میں لٹاتے ہیں زر و سیم
دنیا ہی میں کچھ ذکر نہیں تازہ ہے اس کا
دربار میں اللہ کے آوازہ ہے اس کا

لیکن وہ زر و مال نہیں قابل تحسیں!
انساں کو بنا دے جو شکم پرور و خود بیں
زردار وہ ہے جس میں شرافت کے ہوں آئیں
ہو بزم محبت کے لئے باعث تزئیں
سرسبز رہے قوم یہ انعام ہو اس کا
باراں کی طرح فضل کرم عام ہو اس کا

مانا ہوسِ زر ہے بشر کے لئے عادت
لیکن نہیں دنیا میں فقط اک یہی نعمت
کچھ اور بھی جوہر ہیں عطا کردۂ قدرت
غمخواری و دل جوئی و ہمدردی و الفت

زر آپ نہیں دشمنِ اخلاق و ادب ہے
جو حد سے گذر جاتی ہے وہ اس کی طلب ہے

جو لوگ لئے حرص سے دنیا میں ہیں سرشار
جینے کی لطافت سے نہیں ان کو سروکار
مانند گداز زر کے ہیں ہر وقت طلبگار
آزاد کہاں دامِ طمع میں ہیں گرفتار

محروم مئے عیش سے یہ خستہ جگر ہیں
مالک یہ نہیں زر کے فقط بندۂ زر ہیں

دولت وہ ہے مجبور کی جو عقدہ کشا ہو
اکسیر ہو دردِ دلِ بیکس کی دوا ہو
آئینۂ اخلاق و محبت کی جلا ہو
ظلماتِ فلاکت کے لئے آبِ بقا ہو

یوں فیض کے چشمے ہوں رواں باغ وطن میں
جیسے کرم ابر گہر بار چمن میں

یہ صبح گلستاں میں بصد شانِ فصاحت
بلبل گل رنگیں سے یہ کرتی ہے حکایت
دیکھو چمن آرائے دو عالم کی عنایت
گھٹتے کبھی دیکھی نہیں فیاض کی دولت

گو کم دُرِ خوش آب لٹانا نہیں ہوتا
خالی کبھی شبنم کا خزانہ نہیں ہوتا

مانا سببِ شوکت و اجلال ہے دولت
پر مفلس بیکس بھی نہیں قابلِ نفرت
ادنیٰ سے ملے جھک کے یہ اعلیٰ کی ہے عظمت
بس نشۂ زر سے نہ جھکے چشمِ مروّت

ہے کبر اسے شانِ امارت نہیں کہتے
کچھ کہئے اسے حسنِ شرافت نہیں کہتے

کس اوج پہ خورشید جہاں تاب ہے معمور
دل تیرگیٔ کبر سے کوسوں ہے مگر دور

گو خاک نہیں ذرۂ ناچیز کا مقدور
دیتا ہے اسے جام سے اپنے وہ مئے نور

یا ماہ کا اس اوج پہ کیا فیض عیاں ہے
ہر خانۂ مفلس کے لئے شمع مکاں ہے

یا باغ میں کھلتا ہے دمِ صبح گلِ تر
کیا کیا اسے ہوتے نہیں اعزاز میسّر
بنتا ہے عروسانِ جہاں کے لئے زیور
دستار میں نوشہ کے رہا کرتا ہے اکثر

لیکن نہ کسی وضع پہ اس ڈھنگ سے دیکھا
بیکس کی لحد پر اسے جس رنگ سے دیکھا

دنیا میں جنھیں رُتبۂ عالی ہیں میسّر
بیکس کی وہ امداد کیا کرتے ہیں اکثر
یاں قوم میں حاصل ہے جنھیں اوج فزوں تر
وہ شوئیٔ تقدیر سے دل رکھتے ہیں پتھر

ہمدرد ہوں غیروں کے یہ عادت نہیں ان کی
تکلیف ہے جو وہ طبیعت نہیں ان کی

٭

جلوۂ صبح

جب زنگِ شب آئینۂ ہستی سے ہوا دور
ہنگامِ سحر کون و مکاں ہو گئے پر نور
تبدیل ہوئی صورتِ کوہِ شبِ دیجور
چمکا وہ تجلیِ سحر سے صفتِ طور
بجلی کی طرح چرخ پہ نورِ سحر آیا
آنکھوں کو نہ پھر خرمنِ انجم نظر آیا

تھی نور میں تفریح تو نور ارض و سما میں
سرگرمی بشر میں تھی بشر یادِ خدا میں
تھی تازگی خنکی میں تو خنکی تھی ہوا میں
شادابی تھی نکہت میں تو نکہت تھی صبا میں

خورشید منور کا دم جلوہ گری تھا
نور رخ مہتاب چراغ سحری تھا

دریائے فلک میں تھا عجب نور کا عالم
چکر میں تھا گرداب صفت نیّر اعظم
اٹھتی تھیں شعاعوں کی جو موجیں وہ شر ردم
سیّارے حبابوں کی طرح مٹتے تھے باہم

تھی شورش طوفان سحر غرب سے تا شرق
آخر میں سفینہ مہ گردوں کا ہوا غرق

والشمس تھا کندہ شہ خاور کے نگیں پر
واللیل کا باقی تھا نشاں بھی نہ کہیں پر
تھی مہر کی پھیلی جو ضیا چرخ بریں پر
آنے لگا رہ رہ کے وہی نور زمیں پر

ذرّوں کا ستارہ بھی چمکتا نظر آیا
پیمانۂ خورشید چھلکتا نظر آیا

وہ صبح کا عالم وہ چمن زار کا عالم
مرغان ہوا نغمہ زنی کرتے تھے باہم

ہنگامِ سحر بادِ سحر چلتی تھی بہم
آرام میں سبزہ تھا تہہِ چادرِ شبنم
ہر سمت بندھی نعرۂ بلبل کی ہوا تھی
غنچوں کی نسیمِ سحری عقدہ کشا تھی

جو نخل تھا گلشن میں بر ومند کھڑا تھا
دامانِ سحر میں گلِ خورشید پڑا تھا
کیا خوب مقدر چمنستاں کا لڑا تھا
ہر گل پہ گہر قطرۂ شبنم کا جڑا تھا
بلبل کہیں طاؤس کہیں گھوم رہے تھے
مستوں کی طرح نخلِ چمن جھوم رہے تھے

مرغانِ چمن عالمِ مستی میں سحر دم
وصفِ چمن آرائے جہاں کرتے تھے باہم
شاخیں تھیں کہیں گردنِ تسلیم صفت خم
تسبیحِ خدا میں ہمہ تن محو تھی شبنم
غنچوں کے کھلی تھی ورد زباں حمد خدا کی
آتی تھی چٹکنے میں صدا صلِ علیٰ کی

تھا پیشِ نظر وادیِٔ ایمن کا تماشا
ہر شاخ و شجر میں شجرِ طور کا نقشا
تھا آتشِ گل میں اثرِ برقِ تجلّیٰ
مدہوش تھے مرغانِ ہوا صورتِ موسیٰ

شکل یدِ بیضا تھی ہر اک شاخ نظر میں
اعجاز کا گل تھا کفِ گلچین سحر میں

رونق پہ دم صبح تھا خمخانۂ عالم
تھم تھم کے ہوا چلتی تھی سردی بھی تھی کم کم
پیمانۂ مہتاب تھا لبریز سحر دم
تھا جام صبوحی کے لئے نیّرِ اعظم

گردوں پہ شفق کی بھی عجب جلوہ گری تھی
مینائے فلک میں مئے گلرنگ بھری تھی

آبِ انگور

محیطِ دھر میں تہذیب کا جو دور ہوا
ہوا بدل گئی رنگِ زمانہ اور ہوا
دماغ کے لئے سامانِ فکر و غور ہوا
خدا کی شان جہاں کا عجیب طور ہوا
گھٹا جو جہل تو سامانِ عزّ و جاہ بڑھے
شعور کو جو ترقی ہوئی گناہ بڑھے

جو غور و فکر ہوئے زینتِ جنوں آباد
سجائے عقل نے آسائشوں کے باغ مراد
پڑی ترقیٔ علمی سے عیش کی بنیاد
برائے نشہ ہوئے حکمت کشیدِ ایجاد
جہاں میں آبِ طرب کا ظہور اس سے ہوا
خیالِ پاسِ ادب دل سے دور اس سے ہوا

ہوئی جو بادہ کشی باغِ دہر میں منظور
دل بشر سے ہوئی یک قلم مروت دور
بہ رنگِ شیشہ جو نازک تھا دانۂ انگور
کیا اک آن میں سنگِ جفا سے توڑ کے چور

دلِ عروسِ گلستاں کو دردناک کیا
بھری بہار میں ظالم نے خونِ تاک کیا

کھنچی شراب تو کی بادہ کش نے یوں تعریف
بجا ہے کیجیے آبِ طرب کی جو توصیف
مزا شباب کا آئے پیئے جو اس کو ضعیف
دماغ ہو تر و تازہ وہ پاک و صاف لطیف

کہا ہے پھول تو کچھ اس میں گفتگو بھی ہے
گلوں کا رنگ بھی ہے اور گلوں کی بو بھی ہے

نہ تھا یہ ہوش کہ اس پھول میں ہے رنگِ خزاں
تباہ ہوتی ہے اس سے بہارِ عمرِ رواں
وہ بو ہے اس کی دماغِ بشر ہو جس سے گراں
ہے اس کے رنگ سے خونِ جگر کا رنگ عیاں

ہے خوشگوار پہ سوہانِ روح و جسم ہے یہ
ہوئے اسیر ہزاروں عجب طلسم ہے یہ

رفیق اس کی ہے مستی عدو شعور اس کا
وداعِ ہوش کا سامان ہے ظہور اس کا
خمارِ مرگ جو لائے وہ ہے سرور اس کا
سیاہ قلب کو کر دے جو ہے وہ نور اس کا
لگائے آگ کلیجے میں جو وہ آب ہے یہ
کرے جو طرفہ قیامت وہ آفتاب ہے یہ

خیالِ بادہ کشی دل میں گر ہویدا ہو
تمام قلب سیہ صورت سویدا ہو
زباں مزے پہ جو آبِ طرب کی شیدا ہو
تو سوزِ آتشِ پنہاں جگر میں پیدا ہو
زباں کے واسطے گو رشکِ انگبیں ہے یہ
مگر جگر کے لئے آگِ آتشیں ہے یہ

عدو بشر کی یہ ہے اس پہ ہے خدا کا عذاب
کسی کے دل میں الٰہی نہ ہو ہوائے شراب

نہ اس کے شوق میں برباد ہو کسی کا شباب
کسی کے دل میں الٰہی نہ ہو ہوائے شراب

تباہ سیکڑوں روشن دماغ اس نے کئے
بجھا کے داغ ہزاروں چراغ اس نے کئے

ہزاروں پردۂ عصمت کو چاک چاک کیا
ہزاروں حسن کا اک اک جواں ہلاک کیا
جگر کو خون کیا آرزو کو خاک کیا
چمن جو تھے انھیں صحرائے دردناک کیا

نشاں مٹا ئے امنگوں کے اور ارادوں کے
لہو میں غرق سفینے کئے مرادوں کے

کیا لحاظ نہ شاہوں کا نے وزیروں کا
بنایا دست نگر ہاتھ دستگیروں کا
کیا فقیر سے کم مرتبہ امیروں کا
ریاض خاک میں سب مل گیا فقیروں کا

ہر اک کے خاطر بیکس کی آرزو کھوئی
جواں کا حسن تو پیروں کی آبرو کھوئی

بس اس کی ہجو کا یارا نہیں سخن کے لئے
جگر کو نیش ہے یہ نوش ہے دھن کے لئے
مضر ہے اس کی ہوس حفظِ جان و تن کیلئے
خزاں ہے اس کی ہوا دین کے چمن کے لئے

چمن وہ کون کہ گر اک کلی بھی جھڑ جائے
بہارِ گلشنِ ایماں پہ اوس پڑ جائے

ہزار حیف کہ ہو دورِ بادۂ تہذیب
بشر کے واسطے دنیا میں باعثِ تخریب
نہ تھا زمانۂ وحشت میں گو یہ عیش نصیب
ولیک پاک گناہوں سے تھا یہ عہدِ غریب

نہ تھا شعور تو دنیا میں یوں خراب نہ تھی
تمیزِ نشہ کی جب تک نہ تھی شراب نہ تھی

٭

برسات

ہے ولاتی یاد مے نوشی فضا برسات کی
دل بڑھا جاتی ہے آ آکر گھٹا برسات کی

بندھ گئی ہے رحمتِ حق سے ہوا برسات کی
نام کھلنے کا نہیں لیتی گھٹا برسات کی

اگ رہا ہے ہر طرف سبزہ در و دیوار پر
انتہا گرمی کی ہے اور ابتدا برسات کی

دیکھنا سوکھی ہوئی شاخوں میں بھی جان آگئی
حق میں پودوں کے مسیحا ہے ہوا برسات کی

ہوں شریکِ بزمِ مے زاہد بھی توبہ توڑ کر
جھومتی قبلے سے اٹھی ہے گھٹا برسات کی

اصل تو یوں ہے مے و معشوق کا جب لطف ہے
چاندنی ہو رات کو دن کو گھٹا برسات کی

وہ پپیہوں کی صدائیں اور وہ موروں کا رقص
وہ ہوائے سرد وکالی گھٹا برسات کی

پار اتر جائیں گے بحرِ غم سے زیادہ نوش
لے اُڑے گی کشتیِ مئے کو ہوا برسات کی

خود بخود تازہ امنگیں جوش پر آنے لگیں
دل کو گرمانے لگی ٹھنڈی ہوا برسات کی

وہ دعائیں مے کشوں کی اور وہ لطفِ انتظار
ہائے کن نازوں سے چلتی ہے ہوا برسات کی

میں یہ سمجھا ابر کے رنگین ٹکڑے دیکھ کر
تخت پریوں کے اُڑا لائی ہوا برسات کی

ناز ہو جس کو بہارِ مصر و شام و روم پر
سر زمینِ ہند میں دیکھے فضا برسات کی

٭

لارڈ کرزن سے جھپٹ

(نظم ظریفانہ)

وہ شبِ تاریں تاروں کا فلک پر جمگھٹ
چھپ گیا آنکھ سے بدلی جو زمیں نے کروٹ

دیکھنا شرق میں وہ صبح کا تارا چمکا
وہ عروسِ سحرِ نور نے الٹا گھونگھٹ

بڑھ کے رضواں نے وہ جنت کے دریچے کھولے
آئی وہ گلشنِ فردوس سے پھولوں کی لپٹ

چونک اٹھا پیرِ فلک بانگ لگائی ایسی
مرغ نے گربۂ مسکیں کی جو پائی آہٹ

گدگدایا جو نسیمِ سحری نے آکر
ناز سے سبزۂ خوابیدہ نے بدلی کروٹ

نظر آتا ہے گلستاں میں پرستاں کا سماں
گل کھلے ہیں کہ ہے پریوں کا چمن میں جمگھٹ

یہ بہارِ چمنستاں یہ سحر کا عالم
ہاں ذرا بادۂ گلرنگ تو لانا جھٹ پٹ

ہاں وہ مے ہو کہ جو مل جائے کہیں تھوڑی سی
شیرِ مادر کی طرح شیخ بھی پی لے غٹ غٹ

دیکھنا لے کے صراحی مرا ساقی آیا
جام میں بادۂ گلرنگ دیا اس نے الٹ

اب میں پیتا ہوں لبوں تک مرے ساغر پہنچا
ختم مے ہو گئی لو حلق سے اُتری تلچھٹ

آ گیا جوش طبیعت میں بڑھی گردش خوں
ڈوری آنکھوں کے ہوئے لال چڑھی گرماہٹ

نشّہ میں چور ہوں اور سوجھتی ہے دور کی اب
ڈر ہے کرزن سے نہ ہو جائے کہیں مجھ سے جھپٹ

لیجیے سامنے میرے ہے شبیہہ کرزن
رنگ اس طرح بدلتی ہے کہ جیسے گرگٹ

سرخ غصّہ سے کبھی زرد کبھی صدمہ سے
خوف کے مارے کبھی رنگ میں ہے نیلاہٹ

آئے ہیں آپ تو کچھ حضرتِ کرزن سنئے
آپ اگر منہ کے کڑے ہیں تو ہوں ہم بھی منہ پھٹ

آگیا طیش مجھے دل کا نکالوں گا بخار
صاف کہتا ہوں نہیں بات میں اپنی بنوٹ

مانئے گا نہ برا آدمی ہیں آپ شریف
عالمِ نشہ میں بک جاؤں اگر کچھ سٹ پٹ

ہاں یہ کیوں آپ کے گم ہو گئے ہیں ہوش و حواس
گفتگو میں یہ دکھلائی ہے کیا جھلاہٹ

گل فشانی کے عوض دور کیا دل کا بخار
خوب پھینکا سرِ احباب یہ کوڑا کرکٹ

دیں صلاحیں ہمیں کس رنگ کی ماشاء اللہ
خوب ہم جانتے ہیں آپ ہیں جیسے نٹ کھٹ

گالیاں کس لئے در پردہ سنائیں ہم کو
ناچنے نکلے تو پھر منہ پہ یہ کیسا گھونگھٹ

یا درہ جائے گی لیکن ہے وہ ٹھوکر کھائی
توسنِ طبع کو اب پھر نہ اڑانا سرپٹ

اہلِ بنگال نے کیا خوب کیا ہے حملہ
کہ تری فوج مضامین نے ہے کھایا گھونگھٹ

منہ دکھانا تجھے واجب نہیں کلکتہ میں
اب مناسب تری رہنے کے لئے ہی چنہٹ[1]

خوب بوچھار ہوئی چار طرف سے تجھ پر
پائنیر تک کو نہ خوش آئی تری زیٹ زیٹ

کانگریس والے تو کیا خوش نہیں تجھ سے دل میں
دشمنِ ملک علیگڈھ کے پرانے کھوسٹ

تاج وقعت کا اٹھا سر سے ترے چلتے وقت
بے چراغ آئے نظر صبح کو جیسے ڈیوٹ

جس سے ناشاد رعایا ہے وہ ہے دور ترا
کر دیا ملک کو اس پانچ برس میں چوپٹ

بس ترا چل نہ سکا قحط و وبا سے کچھ بھی
شہر ویران ہیں آباد ہوئے ہیں مرگھٹ

---

[1] لکھنؤ کے قریب ایک قصبہ ہے یہاں غدر ۱۸۵۷ء کی ایک لڑائی میں انگریزوں کو شکست ہوئی تھی۔

اب مناسب ہے یہی کیجئے پنجرا خالی
ہم بھی خوش آپ بھی خوش دور کہیں ہو جھنجھٹ

تو ہو جانے پہ جو راضی تو قسم سر کی ترے
کر کے چندہ تجھے ہم لے دیں ولایت کا ٹکٹ

اور جو تجھ کو نہیں منظور یہ احساں لینا
بھیج دیں ہم تجھے بیرنگ بنا کر پیکٹ

یہی اقرار یہی قول یہی وعدہ تھا
او سخن ساز دغاباز فسوں گر نٹ کھٹ

پھونک ڈالے تری اسپیچوں کے بنڈل ہم نے
اب کی ہولی میں جلائے نہیں چیلے بنکٹ

چیمبرلین[1] سے استاد کا شاگرد ہے تو
یاد ہیں مل[2] کے مقولے نہ اصول سگیٹ[2]

کونسل کے جو ترے ممبر سرکاری ہیں
وہ بھی کم بخت ہیں سب چور کے ساتھی گٹھ کٹ

---

[1] ایک انگریز فلسفی [2] ایک انگریز مصنف

یا الٰہی یہ چلی بادِ مخالف کیسی
آگیا اڑ کے جو لندن سے یہ کوڑا کرکٹ

ہیں مگر ملک میں دو چار تہمتن یاں بھی
آستیں تیرے مقابل میں جو لیتے ہیں اُلٹ

یاد رکھ حشر تلک بھی نہ تجھے بھولے گی
گو کھلے کی وہ چنگھاڑ اور وہ مہتا کی ڈپٹ

چل یہاں سے تو ولایت میں خبر لیں گے تری
چین سے رات کو سوئے گا نہ تو اک کروٹ

داد خواہوں کا تو بس ہے وہی دربارِ عظیم
پارلیمنٹ میں لکھوائیں گے ہم تیری رپٹ

بچ گیا واں بھی تو پھر حشر میں ہوگا انصاف
کام آئے گی خدا سے نہ تری زیٹ زپٹ

تالیاں پیٹیں گے رسوائی پہ تیری مظلوم
دیدنی ہوگی قیامت میں تری گھبراہٹ

اب بھی آ ہوش میں اندازِ حکومت کو بدل
مرد ہو کے تجھے واجب نہیں یہ تریاہٹ

سوچ انجام کو اک روز ہے سب کو مرنا
ہے نمک خوار ہمارا تو نہ کر ہم سے کپٹ

بیٹھ کر مسند وزارت پہ سنبھل کر پیارے
آہِ مظلوم نے شاہوں کے دیئے تخت اُلٹ

اب مِرا "نشّہ" اترتا ہے میں ہوتا ہوں خموش
بس ترے واسطے کافی ہے یہی سرٹیفکیٹ

آگیا ہوش مجھے کُھل گئیں آنکھیں لیکن
اب وہ گرمیٔ زن نظر آتے ہیں نہ وہ ان کا چُرٹ

٭

میرے مولا مری بگڑی کے بنانے والے
تو ہی تقدیر اب اس خطۂ بیکس کی پلٹ

شاہِ ایڈورڈ کا اقبال بڑھا دنیا میں
جس پہ سر پھوڑتے ہیں ہم وہ ہی اس کی چوکھٹ

٭

بس زباں اب نہ ہو تو معرکہ آرائے سخن
رشک سے مرقدِ سودا نہ کہیں جائے اُلٹ

اے عروسِ سخن اللہ رے جوبن تیرا
لاٹ صاحب کو بھی ناگنے ہے تری زلف کی لٹ

حضرتِ پنچ سے بگڑیں گے تو بن جائیں گے
لاٹ صاحب کو مناسب نہیں یاں گھبراہٹ

غزلیات

فنا نہیں ہے محبت کے رنگ و بو کے لئے
بہارِ عالمِ فانی رہے رہے نہ رہے

جنونِ حُبِّ وطن کا مزا شباب میں ہے
لہو میں پھر یہ روانی رہے رہے نہ رہے

رہے گی آب و ہوا میں خیال کی بجلی
یہ مشتِ خاک ہے فانی رہے رہے نہ رہے

جو دل میں زخم لگے ہیں وہ خود پکاریں گے
زباں کی سیف بیانی رہے رہے نہ رہے

مٹا رہا ہے زمانہ وطن کے مندر کو
یہ مرمٹوں کی نشانی رہے رہے نہ رہے

دلوں میں آگ لگے یہ وفا کا جوہر ہے
یہ جمع خرچ زبانی رہے رہے نہ رہے

جو مانگنا ہے ابھی مانگ لو وطن کے لئے
یہ آرزو کی جوانی رہے رہے نہ رہے

٭

زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں
مرے خیال کو بیڑی پہنا نہیں سکتے

یہ کیسی بزم ہے اور کیسے اس کے ساقی ہیں
شراب ہاتھ میں ہے اور پلا نہیں سکتے

یہ بیکسی بھی عجب بیکسی ہے دنیا میں
کوئی ستائے ہمیں ہم ستا نہیں سکتے

کشش وفا کی انھیں کھینچ لائی آخر کار
یہ تھا رقیب کو دعویٰ وہ آ نہیں سکتے

جو تو کہے تو شکایت کا ذکر کم کر دیں
مگر یقین ترے وعدوں پہ لا نہیں سکتا

چراغ قوم کا روشن ہے عرش پر دل کے
اسے ہوا کے فرشتے بجھا نہیں سکتے

عہ مسٹر مانٹیگو وزیر ہند ٭

مٹنے والوں کی وفا کا یہ سبق یاد رہے
بیڑیاں پاؤں میں ہوں اور دل آزاد رہے

ایک ساغر بھی عنایت نہ ہوا یاد رہے
ساقیا جاتے ہیں محفل تری آباد رہے

دل وہ دل ہے جو سدا ضبط سے ناشاد رہے
لب وہ لب ہے جو نہ شرمندۂ فریاد رہے

خوشنوائی کا سبق میں نے قفس میں سیکھا
کیا کہوں اور، سلامت مرا صیاد رہے

تار بگڑا ہوا ہے دل کو سنبھالوں کب تک
لے کی پابند کہاں تک مری فریاد رہے

آپ سے ہم سے ہوا تھا کبھی پیمانِ وفا
کیجیے ظلم مگر وہ بھی گھڑی یاد رہے

باغباں دل سے وطن کو یہ دعا دیتا ہے
میں رہوں یا نہ رہوں یہ چمن آباد رہے

مجھ کو مل جائے چہکنے کے لئے شاخ مری
کون کہتا ہے کہ گلشن میں نہ صیاد رہے

جذبۂ قوم سے خالی نہ ہو سودائے شباب
وہ جوانی ہے جو اس شوق میں برباد رہے

حکم مالی کا یہ ہے پھول نہ ہنسنے پائیں
چپ رہے باغ میں کوئل اگر آزاد رہے

باغ میں لے کے جنم ہم نے اسیری جھیلی
ہم سے اچھے رہے جنگل میں جو آزاد رہے

دم سے گاندھی کے رہے شور وفا بستی میں
قیس جنگل میں رہے کوہ پہ فرہاد رہے

☆

کبھی تھا ناز زمانہ کو اپنے ہند پہ بھی
پر اب عروج وہ علم و کمال فن میں نہیں

رگوں میں خوں ہے وہی دل وہی جگر ہے وہی
وہی زباں ہے مگر وہ اثر سخن میں نہیں

وہی ہے بزم وہی شمع ہے وہی فانوس
فدائے بزم وہ پروانے انجمن میں نہیں

وہی ہوا وہی کوئل وہی پپیہا ہے
وہی چمن ہے یہ وہ باغباں چمن میں نہیں
غرور و جہل نے ہندوستاں کو لوٹ لیا
بجز نفاق کے اب خاک بھی وطن میں نہیں

٭

کسے معلوم ہے کیا رنگ بدلے اب فغاں اپنی
خدا حافظ ہے دل کا بند ہوتی ہے زباں اپنی
پڑی ہیں تیر بن بن کر نگاہیں پارساؤں کی
غزالانِ حرم بھولے ہوتے ہیں شوخیاں اپنی
شفق ہے آسماں پر لالہ و گل باغ و صحرا میں
دکھاتا ہے شہیدوں کا لہو رنگینیاں اپنی
گُلوں نے باغ چھوڑا تنگ آ کر جور گلچیں سے
چمن ویران ہوتا ہے خبر لے باغباں اپنی
فغاں درد دل پر بھی گماں ہے بد زبانی کا
ستمگر سُن نہیں سکتا ہے شاید داستاں اپنی
فریب زندگی جس نے نہ دیکھا ہو مجھے دیکھے
نہ سینے میں ہے دل اپنا نہ منہ میں ہی زباں اپنی

صدا دیتا ہے یہ میرا گریباں چاک ہونے پر
ہزاروں پیرہن پیدا کریں گی دھجیاں اپنی

ہزاروں آرزوئیں داغ بن کر دل میں پنہاں ہیں
کہ جن کا نام لینے سے لرزتی ہے زباں اپنی

نہ بدلی ہے نہ بدلے گی نیرنگ اپنی طبیعت کی
دکھلائے گا کہاں تک آسماں نیرنگیاں اپنی

ﷲ

گردنیں[*] خم ہیں ندامت سے دل آزاروں کی
رہ گئی بات زمانہ میں وفاداروں کی

قاضی وقت نے برسات میں توبہ توڑی
رند آزاد ہوئے عید ہے میخواروں کی

قید سے چھوٹ کے آئے ہیں وفا کے یوسف
سر بازار ہے کیا بھیڑ خریداروں کی

بے گناہوں کا انصاف ہوا دنیا میں
اب ہمیں دیکھنی ہے شرم گنہگاروں کی

---

[*] یہ نظم مسز بسنٹ کی نظربندی کا حکم منسوخ ہونے کے زمانہ میں تصنیف کی گئی تھی

بیڑیاں کٹ کے گریں خاک کے پُتلے کی بھی آج
روح آزاد تھی پہلے ہی گرفتاروں کی
دل میں اس طرح سے ارمان ہیں آزادی کے
جیسے گنگا میں جھلکتی ہے چمک تاروں کی

٭

جہاں میں آنکھ جو کھولی فنا کو بھول گئے
کچھ ابتدا ہی میں ہم انتہا کو بھول گئے
نفاق گبر و مسلماں کا یوں مٹا آخر
یہ بت کو بھول گئے وہ خدا کو بھول گئے

ہوا مزاج کا عالم یہ سیر یورپ سے
کہ اپنے ملک کی آب و ہوا کو بھول گئے
زمیں لرزتی ہے بہتے ہیں خون کے دریا
خودی کے جوش میں بندے خدا کو بھول گئے

یہ انقلاب ہوا عالمِ اسیری میں
قفس میں رہ کے ہم اپنی صدا کو بھول گئے

٭

اگر دردِ محبت سے نہ انساں آشنا ہوتا
نہ کچھ مرنے کا غم ہوتا نہ جینے کا مزا ہوتا

مئے گل رنگ لٹتی یوں درِ میخانہ وا ہوتا
نہ پینے میں کمی ہوتی نہ ساقی سے گلا ہوتا

ہزاروں جان دیتے ہیں بتوں کی بیوفائی پر
اگر ان میں سے کوئی با وفا ہوتا تو کیا ہوتا

رُلایا اہلِ محفل کو نگاہِ یاس نے میری
قیامت تھی جو اک قطرہ ان آنکھوں سے جُدا ہوتا

ہوس جینے کی ہے یوں عمر کے بیکار کٹنے پر
جو ہم سے زندگی کا حق ادا ہوتا تو کیا ہوتا

یہ مانا بے حجابانہ نگاہیں قہر کرتی ہیں
مگر حُسنِ حیا پرور کا عالم دوسرا ہوتا

زباں کے زور پر ہنگامہ آرائی سے کیا حاصل
وطن میں ایک دل ہوتا مگر درد آشنا ہوتا

٭

تو گرفتارِ بلا ہوں کچھ کہا جاتا نہیں
نالہ کرنا بھی مجھے اے ہمنشیں آتا نہیں
مردِ قانع کو نہیں رہتی گدائی کی ہوس
پاؤں پھیلا کر جو بیٹھا ہاتھ پھیلاتا نہیں

مردِ میدانِ محبت زندۂ جاوید ہیں
موت آجانے سے تو انسان مر جاتا نہیں

٭

صنعتِ انساں سے دل کو آشنا کرتے رہے
دل کے آئینہ پہ اُلفت کی جِلا کرتے رہے
دوستی میں اپنا اپنا حق ادا کرتے رہے
وہ جفا کرتے رہے اور ہم وفا کرتے رہے

کیا کہیں کس سے کہیں دنیا میں کیا کرتے رہے
بدعتیں ہوتی رہیں شکرِ خدا کرتے رہے
اہلِ ہمت منزلِ مقصود تک آ بھی گئے
بندۂ تقدیر قسمت سے گلا کرتے رہے

٭

فنا کا ہوش آنا زندگی کا دردِ سر جانا
اجل کیا ہے خمارِ بادۂ ہستی اُتر جانا

عزیزانِ وطن کو غنچہ و برگ و ثمر جانا
خدا کو باغباں اور قوم کو ہم نے شجر جانا

وہ گلشن کی فضا اور چاندنی کا وہ نکھر جانا
وہ پڑھ کر گیسوئے لیلائے شب کا تا کمر جانا

عروسِ جان نیا پیراہنِ ہستی بدلتی ہے
فقط تمہید آنے کی ہے دنیا سے گذر جانا

مصیبت میں بشر کے جوہرِ مردانہ کھُلتے ہیں
مبارک بزدلوں کو گردشِ قسمت سے ڈر جانا

وہ طبع یاس پرور نے مجھے چشمِ عقیدت میں
کہ شامِ غم کی تاریکی کو بھی نورِ سحر جانا

وہی قطرہ لہو کا اشک بن کر گر گیا رسوا
جسے ہم نے نمک پروردۂ زخمِ جگر جانا

مقام کوچ کیا ہے منزلِ مقصود تک بھولے
قیامت تھا سرائے دہر میں دو دن ٹھہر جانا

بہت سودا رہا واعظ تجھے نارِ جہنم کا
مزہ سوزِ محبت کا بھی کچھ اے بے خبر جانا
اجل کی نیند میں بھی خواب ہستی گھر نظر آیا
تو پھر بے کار ہے تنگ آ کے اس دنیا سے مر جانا

وہ سودا زندگی کا ہے کہ غم انسان سہتا ہے
نہیں تو ہے بہت آسان اس جینے سے مر جانا
چمن زارِ محبت میں اُسی نے باغبانی کی
کہ جس نے اپنی محنت ہی کو محنت کا ثمر جانا

سدھاری منزلِ ہستی سے کس بے اعتنائی سے
تنِ خاکی کو شاید روح نے گردِ سفر جانا

❖

نہ کوئی دوست دشمن ہو شریکِ درد و غم میرا
سلامت میری گردن پر رہے بارِ الم میرا
بہار آئی ترقی پر ہے سودا دم بدم میرا
بڑھا جاتا ہے خود زنجیر کی جانب قدم میرا

لکھا یہ داورِ محشر نے میری فردِ عصیاں پر
یہ وہ بندہ ہے جس پر ناز کرتا ہے کرم میرا
کہا غنچہ نے ہنس کر واہ کیا نیرنگِ عالم ہے
وجودِ گل جسے سمجھے ہیں سب ہے وہ عدم میرا
کشاکش ہے امید و یاس کی یہ زندگی کیا ہے
الٰہی ایسی ہستی سے تو اچھا تھا عدم میرا
اگر کون و مکاں اِک شعبدہ تھا اس کی قدرت کا
تو اس دنیا میں آخر کس لئے آیا قدم میرا
دلِ احباب میں گھر ہے شگفتہ رہتی ہے خاطر
یہی جنت ہے میری اور یہی باغِ ارم میرا
مجھے احباب کی پرسش کی غیرت مار ڈالے گی
قیامت ہے اگر افشا ہوا رازِ الم میرا
کھڑی تھیں راستہ روکے ہوئے لاکھوں تمنائیں
شہیدِ یاس ہوں نکلا ہے کس مشکل سے دم میرا
خدا نے علم بخشا ہے ادب احباب کرتے ہیں
یہی دولت ہے میری اور یہی جاہ و حشم میرا

صدا آتی ہے میرے دل کے ویرانے سے راتوں کو
وہ بیٹھا ہوں کہ اک گوشہ ہے صحرائے عدم میرا

زبانِ حال سے یہ لکھنؤ کی خاک کہتی ہے
مٹایا گردشِ افلاک نے جاہ و حشم میرا

کیا ہے فاش پردہ کفر و دیں کا اسقدر میں نے
کہ دشمن ہے برہمن اور عدو شیخِ حرم میرا

٭

باغباں نے یہ انوکھا ستم ایجاد کیا
آشیاں پھونک کے پانی کو بہت یاد کیا

درِ زنداں پہ لکھا ہے کسی دیوانے نے
وہی آزاد ہے جس نے اسے آباد کیا

یاد رہ جائے گا ارمان اسیری میرا
جس نے اس باغ میں صیاد کو صیاد کیا

نیند کیا آئے شہادت کے طلبگاروں کو
فکر رہتی ہے ستمگر نے کسے یاد کیا

ڈر گیا نالۂ شبگیر سے میرے صیاد
شام کو قید کیا صبح کو آزاد کیا

جس پہ احباب بہت روئے فقط اتنا تھا
گھر کو ویران کیا قبر کو آباد کیا

عقل کیا چیز ہے اِک وضع کی پابندی ہے
دل کو مدت ہوئی اِس قید سے آزاد کیا

کس کفِ پاک کو آنکھوں پہ فرشتوں نے لیا
کیوں خرابات جہاں میں اسے برباد کیا

اس کو ناقدری عالم کا صلہ کہتے ہیں
مر چکے ہم تو زمانہ نے بہت یاد کیا

ش

ہم پوجتے ہیں باغِ وطن کی بہار کو
آنکھوں میں اپنی پھول سمجھتے ہیں خار کو

آئے تھے جس چمن سے وہ برباد ہو گیا
اب ہم قفس میں یاد کریں کیا بہار کو

یہ کہہ کے اُن کی بزم میں ہم بھی پہنچ گئے
کیا تھا جو آج یاد کیا خاکسار کو

لایا ہے کیا پیام وطن پوچھتا ہوں میں
غربت میں دیکھتا ہوں جو ابرِ بہار کو

خود ہی مٹا کے جوہرِ ایمان و آبرو
ہم کوستے ہیں گردشِ لیل و نہار کو

٭

ارمان یہی ہے یہی عالم ہے نظر میں
جو بجھ نہ سکے آگ وہ پیدا ہو جگر میں

دنیا مرے نالوں سے کھنچ آتی ہے قفس تک
میلا سا لگا رہتا ہے صیاد کے گھر میں

پابند قفس کی نہیں یہ آہِ شرربار
لگ جائے کہیں آگ نہ صیاد کے گھر میں

رہتی ہیں امنگیں کہیں زنجیر کی پابند
ہم قید ہیں زنداں میں بیاباں ہیں نظر میں

مے خانہ ہے چلتا ہے یہاں سکہ جمہور
سب شاہ و گدا ایک ہیں رندوں کی نظر میں

روشن دلِ ویراں ہے محبت سے وطن کی
یا جلوۂ مہتاب ہے اجڑے ہوئے گھر میں

٭

نہیں منظور جینا روشناسِ چارہ گر ہو کر
رہے گا پاسِ غیرت پردۂ زخمِ جگر ہو کر

شباب آخر ہے بزمِ عیش کی بس یاد باقی ہے
جوانی خواب میں آتی ہے اب شمعِ سحر ہو کر

ازل کے دل مٹا دینا تھا اُس مٹی کی مورت کو
جگائے جس نے فتنے آفرینش کے بشر ہو کر

جگہ خالی کریں غنچوں سے شبنم کا اشارہ ہے
چمن میں قافلے اتریں گے پھولوں کا سحر ہو کر

لئے دریا نے موتی گل شجر نے لال پتھر نے
خریدا ہم نے سودا دردِ اُلفت کا بشر ہو کر

طلوعِ صبح کیا ہے مرثیہ ہے رونقِ شب کا
اڑا ہے رنگ رخ مہتاب کا نورِ سحر ہو کر
یہی اک راستہ باقی تھا کیا اوجِ مراتب کا
بنے اہلِ نظر تم دشمن اہلِ ہنر ہو کر

٭

آپ معشوق ہیں قاتل نہیں جلاد نہیں
دل دکھانے کے لیے حسن خداداد نہیں

اب رہائی کی تمنا دلِ ناشاد نہیں
راستہ اپنے نشیمن کا مجھے یاد نہیں

یہ غلط ہے کہ ہمیں طرزِ فغاں یاد نہیں
اب وہ عالم ہے کہ گنجائشِ فریاد نہیں

دل جو ویران ہوا ہو گئی دنیا ویراں
کوئی گھر خوش نہیں بستی کوئی آباد نہیں

نغمۂ دردِ محبت ہے صدا سے خالی
کیا سُنے کوئی یہ نالہ نہیں فریاد نہیں

پاسِ ناموس ہے غارت گرِ سودائے شباب
دل ہے مٹی اگر اس روگ سے آزاد نہیں

اس کو بے درد گرفتارِ جنوں کہتے ہیں
جس کو دنیا کی غلامی کا سبق یاد نہیں

سبزۂ باغ سے کہتی ہیں یہ شاخیں جھک کر
سر اٹھانے کی جگہ گلشنِ ایجاد نہیں

جب کوئی ظلم نیا کرتے ہیں فرماتے ہیں
اگلے وقتوں کے ہمیں طرزِ ستم یاد نہیں

قدرداں کیوں مجھے تکلیفِ سخن دیتے ہیں
میں سخنور ہی نہیں شاعر نہیں استاد نہیں

ش

زندگی تلخیِ ایام کا افسانہ ہے　　زہر بھرنے کے لئے عمر کا پیمانہ ہے
بے حجاب آج تری نرگسِ مستانہ ہے　　اب جسے ہوش کا سودا ہے وہ دیوانہ ہے
رخ ہے ساقی کی طرف ہاتھ میں پیمانہ ہے　　رہنما آج مری لغزشِ مستانہ ہے
آئی ہے لاش اٹھانے کو نسیمِ سحری　　چھوٹنا بعدِ فنا شمع سے پروانہ ہے
عالمِ یاس میں دریا سے یہ کہتا ہے حباب　　غیر سیراب ہیں خالی مرا پیمانہ ہے

آتش شمع بھی کافور ہے اس کے آگے
دل میں جو آگ چھپائے ہوئے پروانہ ہے

لے چلی بزم سے کس وقت مجھے مرگِ شباب
لب تک آیا بھی نہیں ہاتھ میں پیمانہ ہے

یاد امنگوں کی دلاتا ہے یہ اجڑا ہوا دل
میری بستی کی نشانی یہی ویرانہ ہے

دل ہے مایوس کہ نیت نہیں ساقی کی درست
آنکھ کہتی ہے یہ شیشہ ہے وہ پیمانہ ہے

اک طرف جان ہے، پیمان وفا ایک طرف
امتحان آج ترا ہمت مردانہ ہے

٭

فکر مینا کیوں ہے ساقی کیوں تلاش جام ہے
تو لگا دے منہ سے خم پینا ہمارا کام ہے

مجھ سے روشن ان دنوں دیر و حرم کا نام ہے
پائے بت پر ہے جبیں لب پر خدا کا نام ہے

جن کو پیغام ستم خالی اجل کا نام ہے
ان سے پوچھے کوئی اس دنیا میں کیا آرام ہے

عاشقوں کا اور رندوں کا ہجوم عام ہے
ہے گنہگاروں کا میلہ حشر جس کا نام ہے

صبح کو شبنم کے موتی باغ میں چوری گئے
پھول کرنوں سے یہ کہتے ہیں تمہارا کام ہے

دیکھنا ہے حسن کے جلوے تو بتخانہ میں آ
تیرے کعبہ میں تو واعظ بس خدا کا نام ہے

ہو گیا ہوں ساری دنیا کے گناہوں میں شریک
جب سے میں نے یہ سنا ہے اس کی رحمت عام ہے

نشہ میں آزاد بیٹھا ہوں جہاں کی فکر سے
گردش ساغر پہ صدقے گردش ایام ہے

تیرے دل میں اور میرے دل میں ہے واعظ یہ فرق
وہ چراغ صبح ہے اور یہ چراغ شام ہے

لے اڑے گا نشہ مے آج رندوں کو ضرور
اک پری شیشہ میں ہے بادۂ گلفام ہے

لطف آزادی تھا جن سے چل بسے وہ ہم صفیر
اب چمن کی صبح بھی مجھ کو قفس کی شام ہے

کفر ہے اس کی شکایت جس نے دل پیدا کیا
دل سے جو پیدا ہوئی وہ آرزو بدنام ہے

شرط ہے پی کر مکرنا پارسائی کے لئے!
جو سرِ بازار پیتا ہے وہی بدنام ہے
میرے مذہب میں ہے واعظ ترکِ مئے نوشی حرام
چھوڑ کر پیتا ہوں پھر توبہ اسی کا نام ہے

لطفِ شاہی کی تمنّا غیر کے دل میں رہے
ہم فقیروں ہی سے زندہ لکھنؤ کا نام ہے
فکرِ دنیائے دنی ہے دشمنِ فکرِ سخن
اس کشاکش میں غزل کہنا ہمارا کام ہے

٭

کیا کونپلیں دکھاتی ہیں عالم ابھار کا
آنچل سرک گیا ہے عروسِ بہار کا
ہم مرنٹوں کو ہے یہی موسم بہار کا
دو چار دن پڑا رہے سبزہ مزار کا

یاں چاندنی دکھاتی ہے امبّد کی جھلک
دریا کی لہر دل ہے کسی بیقرار کا

پھولوں کی جھولیوں میں ہیں موتی بھرے ہوئے
شبنم لٹا رہی ہے خزانہ بہار کا

افسردہ خاطرانِ چمن کو خبر نہیں
آیا بھی اور گیا بھی زمانہ بہار کا

پھیلی ہو جیسی گورِ غریباں میں چاندنی
عالم یہ ہے خوشی میں دلِ داغدار کا

شب کو بہار پردۂ شبنم میں رہ گئی
انجام سوچ کر چمن روزگار کا

وہ دن گئے کہ تجھ سے لرزتے تھے اے اجل
اب زندگی ہے نام ترے انتظار کا

وہ آئیں بے پیے جنہیں رہنی ہے بےخودی
محفل میں اپنی کام نہیں ہوشیار کا

افشا ہوا نہ جور قضا و قدر کا راز
پردہ اٹھا نہ مصلحتِ کردگار کا

غنچے عدم سے آئے ہیں پہنے ہوئے کفن
انجام ہے نظر میں دو روزہ بہار کا

آئے ہیں پھول باغ میں ساغر لئے ہوئے
برسے شراب ہے یہ اشارہ بہار کا

٭

مٹی میں گل جو اور کسی بوستاں کے ہیں
کانٹے عزیز گلشن ہندوستاں کے ہیں

ہم سوچتے ہیں رات کو تاروں کو دیکھ کر
شمعیں زمین کی ہیں جو داغ آسماں کے ہیں

صحن چمن سے دور انھیں باغباں نہ پھینک
تنکے جو یادگار مرے آشیاں کے ہیں

جنت میں خاک بادہ پرستوں کا دل لگے
نقشے نظر میں صحبتِ پیرِ مغاں کے ہیں

اپنا مقام شاخ بریدہ ہے باغ میں
گل ہیں مگر ستائے ہوئے باغباں کے ہیں

اک سلسلہ ہوس کا ہے انساں کی زندگی
اس ایک مشتِ خاک کو غم دو جہاں کے ہیں

قصے لکھے ہوئے ہیں جو فرہاد و قیس کے
کھوئے ہوئے ورق وہ مِری داستاں کے ہیں

۴

شورشِ دیر و حرم سے جب پریشاں ہوگئے
کچھ سمجھ کر ہم شریکِ بزمِ رنداں ہوگئے

حسن کے پردے میں کیا کیا عیب پنہاں ہوگئے
طرّہ دستار گل تارِ گریباں ہوگئے

دیکھنا نیرنگ سازیٔ طلسم نوبہار
پیرہن کلیوں کے پھولوں کے گریباں ہوگئے

مفلسی میری محبت کی کسوٹی بن گئی
ہمت احباب کے جوہر نمایاں ہوگئے

دردِ الفت زندگی کے واسطے اکسیر ہے
خاک کے پتلے اسی جوہر سے انساں ہوگئے

عطر افشاں میرے ویرانے میں آئی ہے نسیم
کیا کسی محبوب کے گیسو پریشاں ہوگئے

رہ گئی بازارِ محشر میں گنہگاروں کی ساکھ
رحمتِ باری کے سکے داغِ عصیاں ہو گئے

چار دیوارِ چمن میں کیا دھرا ہے باغباں
دیکھ کوسوں تک ہرے کوہ و بیاباں ہو گئے

اپنے دیوانوں سے ملنے کو چلی آئی بہار
سبزہ و گل صحنِ زنداں میں نمایاں ہو گئے

زندگی میری اسیری کی فقط تمہید ہے
دام میں دانے مری قسمت کے پنہاں ہو گئے

اس تمنا میں کہ آزادی کی دیکھیں گے سحر
ہم اسیرِ کلفتِ شبہائے زنداں ہو گئے

حسن کی دولت سے تھے گلہائے نورس بے خبر
دیکھ کر رنگِ چمن کانٹے نگہباں ہو گئے

جام تک خم سے شراب آنے میں ہو جاتی ہے دیر
ہم تو ساقی کے تکلف سے پریشاں ہو گئے

مے کے قطرے کیا تھے جب تک خم میں تھے ساغر میں تھے
میرے ہونٹوں تک پہنچنا تھا کہ طوفاں ہو گئے

جن کی شورش کے لئے آغوش دنیا تنگ تھا
اشک کے قطرے وہ ان آنکھوں میں پنہاں ہو گئے

☸

شرکتِ غم کا عزیزوں میں جو دستور نہیں
امتحاں ان کی وفا کا مجھے منظور نہیں
کیوں رلانے کو سناتے ہو وفا کے قصے
دوستو اب تو محبت کا یہ دستور نہیں
تپشِ شوق کو موسیٰ کی نظر ہے درکار
ورنہ دنیا میں تجلی نہیں یا طور نہیں
کس جواں مرگ کا دنیا سے ہوا شب کا سفر
یہ سپیدی ہے کفن کی سحر نور نہیں
ختم ہوتا نہیں کیوں ہستی ناشاد کا راگ
یا یہ گل جسم سہی روح تو مجبور نہیں
شہرہ خاص کا طالب جو ہو انساں ہے وہی
ورنہ شیطاں سے زیادہ کوئی مشہور نہیں

وارسونی ہے فقط نعرہ زنی باقی ہے
مست و مجذوب ہیں لاکھوں کوئی منصور نہیں
شام سے صبح تلک جام رہے گردش میں
کرم پیرِ خرابات سے کچھ دور نہیں

ﷺ

دل کے تسخیر بخشا فیضِ روحانی مجھے
حبِ قومی ہوگیا نقشِ سلیمانی مجھے
منزلِ عبرت ہے دنیا اہل دنیا شاد ہیں
ایسی دل جمعی سے ہوتی ہے پریشانی مجھے
جانچتا ہوں وسعتِ دل حملۂ غم کے لئے
امتحاں ہے رنج و حرماں کی فراوانی مجھے
حق پرستی کی جو میں نے بت پرستی چھوڑ کر
برہمن کہنے لگے الحاد کا بانی مجھے
کلفتِ دنیا مٹے بھی تو سخی کے فیض سے
ہاتھ دھونے کو ملے بہتا ہوا پانی مجھے

خود پرستی مٹ گئی قدرِ محبت بڑھ گئی
ماتمِ احباب ہے تعلیمِ روحانی مجھے

قوم کا غم مول لے کر دل کا یہ عالم ہوا
یاد بھی آتی نہیں اپنی پریشانی مجھے

ذرّہ ذرّہ ہے مرے کشمیر کا مہماں نواز
راہ میں پتھر کے ٹکڑوں نے دیا پانی مجھے

لکھنؤ میں پھر ہوئی آراستہ بزمِ سخن
بعد مدّت پھر ہوا شوقِ غزل خوانی مجھے

٭

دردِ دل پاسِ وفا جذبۂ ایماں ہونا
آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا

نو گرفتارِ بلا طرزِ فغاں کیا جانیں!
کوئی ناشاد سکھا دے انھیں نالاں ہونا

چاک ہو کر کفنِ غنچہ بنا جامۂ گل!
کھل گیا رنج سے شادی کا نمایاں ہونا

رہ کے دنیا میں ہے یوں ترکِ ہوس کی کوشش
جس طرح اپنے ہی سایہ سے گریزاں ہونا

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب!
موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

دفترِ حسن پہ مہر یدِ قدرت سمجھو!
پھول کا خاک کے تودے سے نمایاں ہونا

دل اسیری میں بھی آزاد ہے آزادوں کا
ولولوں کے لیے ممکن نہیں زنداں ہونا

گل کو پامال نہ کر لعل و گہر کے مالک
ہے اسے طرۂ دستارِ غریباں ہونا

ہے مرا ضبط جنوں جوشِ جنوں سے بڑھ کر
ننگ ہے میرے لئے چاک گریباں ہونا

قید یوسف کو زلیخا نے کیا کچھ نہ کیا
دلِ یوسف کے لئے شرط تھا زنداں ہونا

٭

دل ہی بجھا ہوا ہو تو لطفِ بہار کیا
ساقی ہے کیا شراب ہے کیا سبزہ زار کیا

یہ دل کی تازگی ہے وہ دل کی فسردگی
اس گلشنِ جہاں کی خزاں کیا بہار کیا

کس کے فسونِ حسن کا دنیا طلسم ہے
ہیں لوحِ آسماں پہ یہ نقش و نگار کیا

اپنا ہی دم ہوا ہے گلوگیر وقتِ نزع
غیروں کا زندگی میں ہو پھر اعتبار کیا

دیکھا سرورِ بادۂ ہستی کا خاتمہ
اب دیکھیں رنگ لائے اجل کا خمار کیا

اب کی تو شامِ غم کی سیاہی کچھ اور ہے
منظور ہے تجھے مرے پروردگار کیا

دنیا سے لے چلا ہے جو تو حسرتوں کا بوجھ
کافی نہیں ہے سر پہ گناہوں کا بار کیا

جس کی قفس میں آنکھ کھلی ہو مری طرح
اس کے لئے چمن کی خزاں کیا بہار کیا

کیسا ہوائے حرص میں برباد ہے بشر
سمجھا ہے زندگی کو یہ مشتِ غبار کیا
خلعت کفن کا ہم تو زمانہ سے لے چکے
اب ہے عروسِ مرگ تجھے انتظار کیا
بعدِ فنا فضول ہے نام و نشاں کی فکر
جب ہم نہیں رہے تو رہے گا مزار کیا
اعمال کا طلسم ہے نیرنگِ زندگی
تقدیر کیا ہے گردشِ لیل و نہار کیا

چلتی ہے اس چمن میں ہوا انقلاب کی
شبنم کو آنے دامنِ گل میں قرار کیا
تفسیرِ حالِ زار ہے بس اک نگاہِ یاس
ہو داستانِ درد کا اور اختصار کیا
دونوں کو ایک خاک سے نشو و نما ملی
لیکن ہوائے دہر سے گل کیا ہے خار کیا
چھٹکی ہوئی ہے گورِ غریباں پہ چاندنی
ہے بیکسوں کو فکرِ چراغِ مزار کیا

کچھ گُل نہاں ہیں پردۂ خاکِ چمن میں بھی
تازہ کرے گی اِن کو ہوائے بہار کیا

راحت طلب کو درد کی لذّت نہیں نصیب
تلووں میں آبلے جو نہیں لطفِ خار کیا

خاکِ وطن میں دامنِ مادر کا چین ہے
تنگی کنار کی ہے لحد کا فشار کیا

انساں کے بغض و جہل سے دنیا تباہ ہے
طوفاں اٹھا رہا ہے یہ مشتِ غبار کیا

❁

دل ہی کی بدولت رنج بھی ہے ، دل ہی کی بدولت راحت بھی
یہ دنیا جس کو کہتے ہیں ہے دوزخ بھی اور جنّت بھی

ارمان بھرے دل خاک ہوئے اور موت کے طالب جیتے ہیں
اندھیر یہ اس دنیا کے ہمیں آتی ہے ہنسی اور رقّت بھی

یا خوفِ خدا یا خوفِ سقر ہیں دو ہی بیاں تیرے واعظ
اللہ کے بندے دل میں ترے ہے سوز و گدازِ محبت بھی

جب تک ہے جوانی کا عالم کیا عیش کی مستی ہوتی ہے
جب پیری موت کی لائی خبر پھر زہد بھی ہے اور طاعت بھی

کرتے ہی زمیں کے دامن میں لے طفل یہ رونا دھونا کیا
دنیا میں اگر تو آیا ہے یاں رنج بھی ہے اور راحت بھی

⁂

نئے جھگڑے نرالی کاوشیں ایجاد کرتے ہیں
وطن کی آبرو اہلِ وطن برباد کرتے ہیں

ہوا میں اڑ کے سیرِ عالم ایجاد کرتے ہیں
فرشتے دنگ ہیں وہ کام آدم زاد کرتے ہیں

نیا مسلک نیا رنگِ سخن ایجاد کرتے ہیں
عروسِ شعر کو ہم قید سے آزاد کرتے ہیں

متاعِ پاسِ غیرت بوالہوس برباد کرتے ہیں
لبِ خاموش کو شرمندۂ فریاد کرتے ہیں

ہوائے تازہ پاکر بوستاں کو یاد کرتے ہیں
اسیرانِ قفس وقتِ سحر فریاد کرتے ہیں

ذرا اے کنجِ مرقد یاد رکھنا اس ہمیت کو
کہ گھر ویران کر کے ہم تجھے آباد کرتے ہیں

ہر اک خشتِ کہن افسانۂ دیرینہ کہتی ہے
زبانِ حال سے ٹوٹے کھنڈر فریاد کرتے ہیں

اذاں دیتے ہیں بتخانہ میں جا کر شانِ مومن سے
حرم میں نعرۂ ناقوس ہم ایجاد کرتے ہیں

نہیں گھٹتی مری آنکھوں میں تاریکی شبِ غم کی
یہ تارے روشنی اپنی عبث برباد کرتے ہیں

تھکے ماندے مسافر ظلمتِ شامِ غریباں میں
بہارِ جلوۂ صبحِ وطن کو یاد کرتے ہیں

جنابِ شیخ کو یہ مشق ہے یادِ الٰہی کی
خبر ہوتی نہیں دل کو زباں سے یاد کرتے ہیں

سبق عمرِ رواں کا دل نشیں ہونے نہیں پایا
ہمیشہ بھولتے جاتے ہیں جو کچھ یاد کرتے ہیں

نہ جانی قدر تیری عمرِ رفتہ ہم نے کالج میں
نکل آتے ہیں آنسو اب تجھے جب یاد کرتے ہیں

؎ یہ غزل کیننگ کالج کے مشاعرہ میں پڑھی گئی تھی۔

رفتہ رفتہ یہ بڑھا جلوۂ تاثیرِ بہار
سبز پوشانِ چمن بن گئے تصویرِ بہار

بس ترا حسن رہا قید لوازم سے بری
پیکرِ گل کو پنھائی گئی تصویرِ بہار

دیکھنا خانۂ قدرت کی یہ رنگ آمیزی
ورقِ گل پہ لکھا نامۂ تقدیرِ بہار

صبحدم آئینۂ آب میں ہے عکسِ چمن
کھینچ دی ہے یدِ قدرت نے یہ تصویرِ بہار

سیکڑوں پھول کھلے پر نہ کھلی دل کی کلی
ہم قفس میں نہیں شرمندۂ تاثیرِ بہار

عکسِ مہ قطرۂ شبنم میں ہے شبنم گل پر
پردۂ شب میں چمک اٹھی ہے تقدیرِ بہار

پردۂ خاک سے گل جام بکف نکلا ہے
مے کی تاثیر سے کچھ کم نہیں تاثیرِ بہار

٭

مئے جوانی ہے مری دل مرا میخانہ ہے
یاں صراحی ہے نہ شیشہ ہے نہ پیمانہ ہے
دلِ مایوس میں کیفیتِ امید کہاں
مئے کے قابل نہیں، ٹوٹا ہوا پیمانہ ہے

ؔ

دوست مرنے پہ مرے دادِ وفا دیتے ہیں
ہائے کس وقت محبت کا صلہ دیتے ہیں
دشمنوں سے بھی مجھے ترکِ وفا مشکل ہے
دوست بن کر مجھے کم بخت دغا دیتے ہیں

ؔ

اڑا کر صحن گلشن سے مٹا کر آشیاں میرا
مرے سایہ کے پیچھے پھر رہا ہے باغباں میرا
کسی کو کیا۔ موافق ہو گیا گر باغباں میرا
صبا میری چمن میرا چمن میں آشیاں میرا
ہجوم بیکسی ہے شامِ تنہائی ہے اور میں ہوں
صدائے چارہ گر برہم نہ کر دے یہ سماں میرا

تہہ و بالا کیا ہے گردشِ اعمال نے مجھ کو
نہ دشمن ہے زمیں میری نہ دشمن آسماں میرا

صفائے قلب سے اللہ رے انساں کی عظمت
فرشتے چومتے ہیں آ کے سنگِ آستاں میرا

مجھے دیر و حرم سے واسطہ کیا زندہ مشربِ ہوں
وہی ایمان ہے جو کچھ کہے پیرِ مغاں میرا

یہ ماتم ہے مصور اٹھ گیا گلزارِ قدرت کا
ہر اک طائر ہر اک برگِ چمن ہے نوحہ خواں میرا

نہ اگلی تازگی ہے اور نہ حدت ہی جوانی کی
پرانا ہو گیا افسانۂ عمرِ رواں میرا

سفر میں زندگی کے سو گیا ہوں تھک کے منزل پہ
اجل کے نام سے بدنام ہے خوابِ گراں میرا

چمن کو چھوڑ دوں یہ بدنصیبی کا اشارہ ہے
وہی مرجھا گئی جس شاخ پر تھا آشیاں میرا

اسیری میں زباں سے میری سنکر رازِ آزادی
گریباں پھاڑ کر سر دھن رہا ہی پاسباں میرا

الٰہی خیر ہو میں نے قفس میں خواب دیکھا ہے
کہ شمعِ صحنِ گلشن بن گیا ہے آشیاں میرا

وطن میں بے وطن مجھ کو کیا ہے اک فسوں گر نے
نہ میں ہندوستاں کا ہوں نہ ہے ہندوستاں میرا

تمنا اب کسے باقی ہے اسرافِ معانی کی
بہت لٹتا رہا سرمایۂ لطفِ بیاں میرا

الٰہی خیر ہو کیا سرگذشتِ دل سنائے گا
لرزتا ہے مری آنکھوں میں کیوں اشکِ رواں میرا

٭

حیف جینے کی تو ایک آدھ گھڑی باقی ہے
مے مرے حصّہ کی شیشہ میں بھری رہتی ہے

موت کہتی ہے کہ لبریز ہے پیمانۂ عمر!
دوست کہتے ہیں کہ امید ابھی باقی ہے

موت کے رنگ سے مٹتا ہے کہیں رنگِ شباب
زرد چہرہ پہ جوانی کی ہنسی باقی ہے

زندگی نام تھا جس کا اسے کھو بیٹھے ہم
اب امیدوں کی فقط جلوہ گری باقی ہے

ہل گئے سات طبق ہو گئی دنیا ویراں
مگر انساں کی ابھی بے خبری باقی ہے

میری نیکی تو مرے ساتھ گئی دنیا سے
کیا ابھی دل میں رقیبوں کے بدی باقی ہے

✿

قطعہ

(الہ آباد کے ایک مشاعرہ سے غیر حاضری کا معذرت نامہ)

پا بہ زنجیرِ علالت سے ہوں مجبوری ہے
کششِ بزمِ سخن سے مجھے انکار نہیں

تنِ خاکی پرِ پرواز کہاں سے لائے
دل تڑپتا ہے قدم مائلِ رفتار نہیں

باکمالوں کی زیارت ہو تمنا تھی یہی
ورنہ مجھ کو ہوسِ گرمیٔ بازار نہیں

منزلِ عیش مجھے گوشۂ گمنامی ہے
دل وہ یوسف ہے جسے فکرِ خریدار نہیں

رونقِ بزم نہیں میرے قدم کی محتاج
فکر بے کار ہے پھولوں میں اگر خار نہیں

ذکر کیوں آئے گا بزمِ شعرا میں اپنا
میں مخلص کا بھی دنیا میں گنہگار نہیں

کلام متفرق

مری بیخودی ہے وہ بیخودی کہ خودی کا وہم وگماں نہیں
یہ سرورِ ساغرِ مے نہیں یہ خمارِ خواب گراں نہیں

جو ظہورِ عالمِ ذات ہے یہ فقط ہجوم صفات ہے
ہے جہاں کا اور وجود کیا جو طلسم وہم وگماں نہیں

یہ حیات عالمِ خواب ہے نہ عذاب ہے نہ ثواب ہے
وہی کفر ودیں میں خراب ہے جسے علمِ رازِ جہاں نہیں

وہ ہے سب جگہ جو کرو نظر وہ کہیں نہیں جو ہو بے بصر
مجھے آج تک نہ ہوئی خبر وہ کہاں ہے اور کہاں نہیں

نہ وہ خم میں بادہ کا جوش ہے نہ وہ حُسن جلوہ فروش ہے
نہ کسی کو رات کا ہوش ہے وہ سحر کو شب کا سماں نہیں

یہ زمیں پہ جن کا تھا دبدبہ کہ بلند عرش پہ نام تھا
انھیں یوں فلک نے مٹا دیا کہ مزار کا بھی نشاں نہیں

☆

جہاں میں ہوں زباں جس طرح دہن کے لئے
سخن ہے میرے لئے اور میں سخن کے لئے

بشر کا دل وہ نہیں سنگ وحشت ہے لاریب
کہ جس میں درد محبت نہ ہو وطن کے لئے

خراب غفلتِ احباب سے ہوئی مٹی
ہماری لاش پڑی رہ گئی کفن کے لئے

☆

ابھی نیا جوش عشق کل ہے صلاح سنتے نہیں کسی کی
کریں گے آخر میں پھر وہی ہم جو چار یار آشنا کہیں گے

ہمارے اور زاہدوں کے مذہب میں فرق اگر ہے تو اس قدر ہے
کہیں گے ہم جس کو پاسِ انساں وہ اس کو خوفِ خدا کہیں گے

☆

روح کو اپنی ہے عشقِ جوہرِ حسن لطیف
گل سے بڑھ کر ہے خیال رنگ و بو میرے لئے

خانہ ویرانی مری سب چاہتے ہیں شکل دُر
اک بلائے جاں ہے میری آبرو میرے لئے

قطرۂ شبنم جسے طوفاں ہے وہ بلبل ہوں میں
بوئے گل ہے باعثِ دردِ گلو میرے لئے

روح و قالب کی طرح روزِ ازل پیدا ہوا
لکھنؤ کے واسطے ہیں لکھنؤ میرے لئے

☆

جو نکتہ سنج تھے اُن کا نشاں نہیں ملتا
سنائیں کس کو سخن قدرداں نہیں ملتا

مٹا یا گردشِ دوراں نے اس طرح مجھ کو
کہ بیکسی کو بھی میرا نشاں نہیں ملتا

کہاں احاطۂ ہستی سے بھاگ کر جاؤں
نئی زمیں نیا آسماں نہیں ملتا

ہوئے قفس سے رہا بھی تو کس مصیبت میں
اندھیری رات ہے اور آشیاں نہیں ملتا

☆

ناشاد رہے ناکام رہے تقدیر ہی اپنی پھوٹ گئی
جس شاخ پہ ہم نے ہاتھ دھرا وہ شاخ وہیں ہی ٹوٹ گئی

اب چین کہاں آرام کہاں امید کہاں ارمان کہاں
آئی تھی الم کی فوج گراں وہ دل کی بستی لوٹ گئی

٭

ہے رنگ آنکھ کو محسوس اور دماغ کو بو
وہ شئے جو اصل میں گل ہے کہیں چمن میں نہیں

٭

فصلِ گل میں عشقِ گل فصلِ خزاں میں یادِ گل
میں اسیرِ الفتِ نیرنگِ گلشن ہو گیا

٭

رباعیات

بو گل کے لئے ہے گل ہے شبنم کے لئے
اک ربط ہے انتظامِ عالم کے لئے
لیکن ہے مرا شباب ماتم کے لئے
غم میرے لئے ہے اور میں غم کے لئے

٭

بیکار تعلّی سے ہے نفرت مجھ کو
لوں دادِ سخن نہیں یہ عادت مجھ کو
کس واسطے جستجو کروں شہرت کی
اک دن خود ڈھونڈھ لے گی شہرت مجھ کو

٭

آباد ہے اصل میں نہ ویرانہ ہے
شادی کا یہ گھر ہے نہ عزاخانہ ہے
واللہ نہ مبتدا ہے اس کی نہ خبر
دنیا اک نا تمام افسانہ ہے

☆

طفلی کا جمال ہے قمر کی صورت
ٹھنڈک پیری میں ہے سحر کی صورت
لیکن وہ قیامت کا سماں ہے جس دم
ڈھلتا ہے شباب دوپہر کی صورت

☆

ختم شد